فہرست مضمون نگارانِ معارف

(جلد ۱۱۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	جناب مولوی محمد ایوب صاحب استاد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر	۵۷	۱۶	جناب ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۶۷
۱۴	جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی	۲۹۵، ۳۹۲، ۴۴۸	۱۷	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴، ۵، ۱۲، ۷۷، ۸۲، ۱۴۳، ۲۱۶، ۳۱۲، ۴۰۲
۱۵	جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ	۲۰، ۱۴۳	۱۸	جناب سید وحید اشرف صاحب لکچرر شعبۂ فارسی و اردو سا جی راؤ یونیورسٹی (بڑودہ)	۱۰۹

شعراء

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	جناب اسلم صاحب سندیلوی	۱۵۴	۵	جناب عروج زیدی	۲۳۳
۲	جناب توقیر جمال لکھنوی	۱۵۴	۶	جناب ولی الحق انصاری لکھنؤ	۲۳۴
۳	جناب محمد شرف الدین صاحب ساحل	۱۵۲			
۴	جناب عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری	۱۵۱	۷	جناب وارث القادری	۲۳۵

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۱۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء

بہ ترتیب حروف تہجی

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲	۹	قرآن پاک اور مرزا غالب	۲۷، ۱۴۳،
۱	اردو کا اصلاح شدہ رسم خط	۴۰۰	۱۰	مسعود بک (ہندوستان کے حسین بن منصور حلاج)	۲۰۶،
۲	اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید	۱۲۵، ۱۸۹		مکتوب ماسکو	۴۷۲
۳	ایک ہندوستانی صحابی بابا رتن	۱۰۹	۱۲	ملا محمود جونپوری	۵، ۲۱۶
۴	آیہ و اور تنہا نبی اسرائیل پر ایک نظر	۲۹۵، ۳۹۲، ۴۴۸		ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے ماخذ	۲۴۵، ۳۲۵، ۴۰۵
۵	چند قدیم نایاب سکے	۲۲۹ [handwritten: ۲۱۶]	۱۳	مولانا محمد علی کی یاد میں	۸۵، ۱۶۵، ۲۶۳، ۳۴۷،
۶	خریطۂ جواہر	۴۵، ۳۱۲			
۷	دیوان ہادی	۲۷۹	۱۴	ہندوستان میں مشرق وسطیٰ سے متعلق مطالعتی ادارہ کا قیام (ایک تجویز اور خاکہ)	۳۶۷،
۸	علم بلاغت کی ابتداء اور ارتقاء	۴۲۷،			

تلخیص وتبصرہ

باب التقریظ والانتقاد

ادبیات

مطبوعات جدیدہ

جلد ۱۲ ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۳ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مرکزی حکومت کے پرانے ارکان میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے دارالمصنفین کے بزرگوں کے پرانے تعلقات تھے، اس لئے اُن کے زمانہ میں مختلف موقعوں پر حکومت ہند نے دارالمصنفین کی مدد کی، مگر اترپردیش کی حکومت سے ہمیشہ بیگانگی رہی، اُس نے صرف دارالمصنفین کی جوبلی کے موقع پر دس ہزار روپیہ دیئے تھے، اترپردیش کے موجودہ گورنر عالیجناب اکبر علی خاں صاحب نہ صرف دارالمصنفین کے کاموں اور اسکی اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں، بلکہ دارالمصنفین کے پرانے ارکان سے اُن کے تعلقات رہ چکے ہیں، اور وہ خود بھی علم دوست اور علم نواز ہیں، اب سے چند مہینے پہلے جب موصوف اعظم گڈھ کے دورے پر آئے تھے، تو خاص طور سے دارالمصنفین کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے، اور اُس کے کاموں کو دیکھکر مسرور ہوئے اور بعض مفید مشورے بھی دیئے، اور اُس کی مالی حالت سُن کر حکومت اترپردیش سے اس کے لئے ایک لاکھ کی امداد کی سفارش کی، اور اپنے قلم سے اس کی منظوری دی، یہ امداد قلمی نسخوں کے تحفظ کے لئے ملی ہے جس میں تعمیر بھی شامل ہے، جو اسی مصرف میں صرف ہوگی، دارالمصنفین کے کارکن اور اس کی مجلسِ انتظامیہ کے ارکان اس گراں قدر عطیہ کے لئے عالیجناب اکبر علی خاں صاحب اور حکومت اترپردیش کے دل سے شکر گذار ہیں، اتنی بڑی رقم دارالمصنفین کو پہلی مرتبہ ملی ہے، جس سے اترپردیش کی حکومت کی بے توجہی کی پوری تلافی ہوگئی، اس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے،

ایک مدت کے بعد اب مرکزی اور اترپردیش کی حکومت کو اُردو کی حق تلفی کا احساس ہوا ہے،

اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے اُس کی طرف توجہ کی ہے، اترپردیش کی حکومت اس سے پہلے اردو اکیڈمی قائم کر چکی ہے، جو مختلف طریقوں سے اُردو کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے، اب اُس نے پرائمری اسکولوں سے لیکر ڈگری کالجوں تک میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا ہے، اور بعض دوسرے محکموں میں بھی اُس کو کچھ حقوق دیئے ہیں جن کی تفصیل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اب اردو کو پہلے کے مقابلہ میں بہت سے حقوق مل گئے ہیں، اگر اُن پر پورا عمل ہوا تو اردو کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا،

مگر پچیس ۲۵ سال میں اردو اتنی پچھڑ چکی، بلکہ قریب قریب ختم ہو چکی ہے کہ اُس کی تلافی آسان نہیں ہے، دوسرے حکومت کی نیت کتنی ہی نیک ہو لیکن اُس کے پورے عملہ کی ذہنیت اردو کے بارہ میں بہت خراب ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ وہ اب بھی اس طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے گا کہ اس کی گرفت آسان نہ ہوگی، مگر اس وقت حکومت اُردو کی تعلیم چاہتی ہے اس لئے اگر اردو والے مستعدی سے کام لیں تو یہ رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں، سب سے بڑی رکاوٹ معاشی ہے جب تک کسی زبان سے معاشی فائدہ متعلق نہ ہو محض زبان کی خاطر اُس کے پڑھنے والے مشکل سے ملیں گے، اس لئے ان طول طویل انتظامات کے مقابلہ میں آسان شکل یہ ہے کہ اُردو کو اس صوبے کی دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے، جو اُردو والوں کا اصل مطالبہ ہے، ورنہ کم از کم اس کی متوسط تعلیم لازمی کر دی جائے، بڑی ملازمتوں کے لئے اُردو سے واقفیت ضروری قرار دی جائے، اور اُن کے امتحانات میں ایک پرچہ اردو کا بھی رکھا جائے، اس کے بغیر اردو کی تعلیم کا مسئلہ پوری طرح حل نہ ہوگا،

تاہم سردست حکومت نے اُردو کی تعلیم کا جو انتظام کیا ہے اور اس کو جو سہولتیں دی ہیں اُن سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے، اس سے اور راہیں بھی کھلیں گی، اس لئے اُردو کے تمام بہی خواہوں اور اُس کی

تنظیموں کا یہ فرض ہے کہ وہ اردو پڑھنے والے طلبہ فراہم کریں اور اردو مادری زبان کے جو طلبہ زیر تعلیم ہیں اُن کو اردو پڑھنے پر آمادہ کریں، ثانوی اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت کے بجائے مادری زبان رکھی جائے، جو اس کا اصل مقصد ہے، اس سلسلہ میں ایک مسئلہ اردو میڈیم اسکولوں کا ہے اس کے بغیر مادری زبان میں تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا، ہر جگہ تو انکی ضرورت نہیں ہے لیکن بڑے شہروں میں بقدر ضرورت اردو میڈیم اسکول قائم کئے جائیں، مسلمانوں کے جونیر اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے پرائمری درجات کو آسانی سے اردو میڈیم بنایا جا سکتا ہے، جس کی پہلے سے اجازت موجود ہے، ہندی تو ان سب میں لازمی ہوگی، اس لئے آیندہ چل کر ہندی میڈیم کے درجوں میں کوئی زحمت نہ پیش آئے گی، اور اگر کچھ ہوئی تو تھوڑی سی محنت سے دور ہو سکتی ہے اردو کے لئے اتنا تو کرنا ہی پڑیگا اگر اس وقت بھی اردو والوں نے بے توجہی سے کام لیا، تو حکومت کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ وہ تو اردو کی تعلیم چاہتی ہے اردو والے خود ہی پڑھنا نہیں چاہتے، اس سے موجودہ انتظام کو ختم کرنے کا جواز بھی نکل آئے گا اور اُس کی تعلیم کی جو راہ نکلی ہے، وہ ختم ہو جائے گی، اور آیندہ اردو والوں کو کسی نئے مطالبہ کا حق نہ رہ جائے گا،

ایک مدت کے انتظار کے بعد ہم ناظرین کو یہ خوشخبری سُنانے کے قابل ہو سکے ہیں کہ الحمد للہ حیات سُلیمان چھپ کر تیار ہو گئی ہے، جولائی کے آخر میں شائع ہو جائے گی، اس میں ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی اکیسویں صدی کے نصف اوّل کی پوری تاریخ آگئی ہے، حیاتِ سلیمان کے لئے شائقین کا بڑا تقاضا تھا، دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس کا عملی ثبوت کہاں تک دیتے ہیں، مقدمہ فہرست اور انڈکس کو چھوڑ کر کتاب کی ضخامت ۷۳۰ صفحات ہے، قیمت: سترہ روپیے،

مقالات

مُلّا محمود جونپوری

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

علمی چشمک | ملا محمود فاروقی اور دیوان محمد رشید عثمانی استاذ الملک ملا محمد افضل عثمانی کی دو آنکھیں تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے دونوں شاگرد علم و کمال میں تفتازانی اور جرجانی کے درجہ کے ہیں، یہ دونوں طالب علم ملا محمد افضل کی درسگاہ کے آفتاب و ماہتاب تھے، اور اثنائے درس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، ذہین و طباع طالب علموں کی معاصرانہ چشمک ایک دوسرے کے لئے علمی مہمیز کا کام دیتی ہے، اور اس سے بڑے علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ یہ معاصرت و مسابقت صرف علم و فن تک محدود ہو، ملا محمود اور دیوان محمد رشید میں اسی قسم کی معاصرت شروع سے تھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک دن ملا محمود اور دیوان محمد رشید دونوں اپنے استاد ملا محمد افضل کے مکان پر موجود تھے، ملا محمد افضل اندر سے نکلے تو ان کے ہاتھ میں فن مناظرہ کی مشہور کتاب "شریفیہ" کے دو نسخے تھے، انھوں نے ان دونوں کو ایک ایک نسخہ دیا اور کہا کہ بہت خوب متن ہے، دیوان

محمد رشید نے شریفیہ کی تعریف اور متن کہنے سے سمجھا کہ استاد اس کی شرح لکھنے کا اشارہ کرتے ہیں، چنانچہ وہ ایک ہفتہ کے بعد شریفیہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسے دیکھ کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے، ملا محمود کو اسکی خبر ہوئی، تو ان کے جذبہ معاصرت کو ٹھیس لگی، انھوں نے اپنے شاگرد ملا محمد باقی بن مفتی ابو البقاء متوفی ۱۰۸۶ھ سے شریفیہ کی دوسری شرح لکھنے کی فرمائش کی، اور شرح رشیدیہ کے رد کا بھی اشارہ کیا، ملا محمد باقی بڑے عالم و فاضل تھے، انھوں نے قلیل مدت میں شریفیہ کی دو شرحیں لکھ دیں، ایک الآداب الباقیہ فی شرح الشریفیہ اس میں متن شریفیہ کی خالص شرح تھی، اور دوسری الابحاث البقیہ فی شرح الرشیدیہ، اس میں دیوان محمد رشید کی شرح پر اعتراضات تھے، ملا محمد باقی نے الآداب الباقیہ کے دیباچہ میں اپنے استاد ملا محمود کی دل کھول کر تعریف کی ہے، بعد میں دیوان محمد رشید کے ایک شاگرد نے رد الباقیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں ملا محمد باقی کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں، اس کا قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں موجود ہے[1]، شیخ نور الدین جعفر بن عزیز اللہ جونپوری متوفی ۱۰۹۳ھ نے ملا محمد باقی کی کتاب الابحاث باقیہ کے رد میں ایک کتاب "نور الانوار" کے نام سے لکھی جس میں اپنے استاد دیوان محمد رشید کی طرف سے دفاع کیا ہے، وہ سلسلۂ مداریہ کے مشائخ میں سے تھے، ان کے تلامذہ میں شیخ محمد افضل الہ آبادی، اور شیخ محمد ماہ دیوگامی مشہور ہیں[2]، ان دونوں استاد بھائیوں کی علمی نوک جھونک سے جونپور کے علماء فن مناظرہ کی طرف متوجہ ہوئے، ملا محمد صادق نے الآداب الصادقیہ کے نام سے فن مناظرہ میں ایک کتاب لکھی،

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۹، ۵۰، [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۰، ۱۱۱،

مکارم اخلاق اور جاہ و ثروت

ملا محمود دیار پورب کے ان چند اعاظم رجال میں تھے جن کو شاہجہان اور اس کے امراء و وزراء کی خصوصی توجہات حاصل تھیں، شاہجہاں، شاہزادہ محمد شجاع، آصف خاں، شائستہ خاں اور سعد اللہ خاں وغیرہ ان کے عقیدتمندوں میں تھے، مستقل جاگیروں اور وقتی نوازشوں کے علاوہ ملا صاحب کو بادشاہ کی طرف سے منصب سہ صدی ذات حاصل تھا، اور وہ نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، جونپور کے مدرسۂ شاہی میں درس دیتے تھے اور امیرانہ انداز سے زندگی گذارتے تھے، حکمت و فلسفہ میں طوسی و دوانی کے حریف اور ادب و بلاغت میں جرجانی اور تفتازانی کے مدمقابل تھے، اس علمی مرتبہ اور دنیاوی وجاہت کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، نخوت کا دل میں نام و نشان نہ تھا، مولانا ابو الخیر نے شیر و شکر میں ان کو مکارم اخلاق کا آفتاب بتایا ہے اور لکھا ہے "یگانۂ انفس و آفاق و آفتاب مکارم اخلاق است"

ملا صاحب کی کتاب الفرائد کے مقدمہ سے کچھ عبارتیں ہم نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ملا صاحب کے دلمیں اپنے محسن شاہجہاں کے لئے امتنان و تشکر کا کتنا جذبہ ہے اور اپنے اساتذہ و خاص طور سے ملا محمد افضل کی کتنی عظمت تھی، اور وہ اپنے تلامذہ کی خیر خواہی و نفع رسانی کے کس قدر حریص تھے، الفرائد کے شروع میں شاہجہاں کی تعریف و توصیف کے بعد لکھا ہے،

وما هو الا الملك القرم الهمام المجد الخضم المقدام مجدد الملة على رأس الالف، محيد المعدلة من غير نفر ولا سرف السلطان بن السلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان بن الخاقان المنصور على العتاة، المظفر على الطغاة في المعارك والمغازي

ابو المظفر شہاب الدین محمد الصاحب القران الثانی، شاہجہاں بادشاہ الغازی، لازال نظام العالم منوطاً بحقوی سلطنتہ وصلاح بنی آدم مضبوطاً بیدی دولتہ ما قام بتیسیر وسمر ابنا سیر انفقت بحضرتہ بضاعتی فان نیالہا من سعادۃ وقد ماقلت من الغلطۃ سجل جادۃ واللہ سبحانہ اسأل ان یصلح فاسدی ویبقی کاسدی، ویکتفی بر حسنۃ، ویبوء فی فی جنۃ ویجزی عنی افضل جزاء اساتذتی الافضل منہم فالافضل وینفع بکتابی تلامذتی الامثل منہم فالامثل، انہ علی کل شیء قدیر، وباجابۃ دعاء السائلین جدیر، [1]

ملا صاحب نے الفرائد جوانی میں لکھی تھی، جب اس زمانے میں ان کے حسن اخلاق، خلوص نیت اور صفائی باطن کا یہ حال تھا تو آگے چل کر ان کا کیا مقام رہا ہوگا؟

زندہ دلی اور شاعری ملا محمود بھی حکماء و فلاسفہ کی طرح نازک خیال مگر زندہ دل آدمی تھے، حکمت و فلسفہ اور شعر و ادب کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے، مگر ملا صاحب جتنے بلند پایہ حکیم و فلسفی تھے، اس پایہ کے شاعر و ادیب بھی تھے، انکی زندہ دلی کا ثبوت ان کا ایک چھ ورقہ رسالہ "نایکا بھید" فارسی زبان میں ہے اس میں بقول آزاد بلگرامی عورتوں کی قسمیں بیان کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اہل ہند نے ناز و انداز عمر اور مراتب الفت و محبت کے اعتبار سے معشوق کی مختلف قسمیں کی ہیں اور انکا الگ الگ نام رکھا ہے اور اس کے مطابق اشعار کہے ہیں اور اس طرح معشوقہ کے ہر دو دادر ہر حال کا سراپا بیان کیا ہے، چونکہ یہ رسالہ فارسی

[1] الفرائد فی شرح الفوائد ص ۶ و ۷،

زبان میں ہے اس لئے اس میں ہندی اشعار مثال میں نہیں آسکے [1] اور انکی شاعری کے متعلق تجلی نور میں ہے،

ملا محمود طبع سخنوری ہم نیکو داشت، شاعر اوا بند، و موجد انداز ہائے دل پسند بود، محمود تخلص کرد، دو دیوان فارسی دارد، ایکے دیوان شعراء و دو یمیں مستند شعراء،

ملا محمود شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے وہ نہایت اچھے شاعر اور دل پسند طریقوں کے موجد تھے، کامیاب شاعر تھے، تخلص محمود تھا، ان کے فارسی اشعار کے دو دیوان تھے، ایک دیوان شعراء اور دوسرا مستند شعراء،

ہمارا خیال ہے کہ ملا صاحب کے یہ دونوں دیوان صرف ان کے اشعار پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ ان کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں مختلف شعراء کے منتخب اشعار تھے جن میں ملا صاحب نے اپنے اشعار بھی درج کئے تھے اور دوسرے میں مستند شعراء کے حالات و اشعار تھے، ان کے چند اشعار یہ ہیں:-

ہر آں رے کہ ندارد خمار در لب شست ۔۔۔ چہ اور چشم تو پیوستہ در خمار بود

انکہ کہ راز عشق بگوید فسانہ نی ست ۔۔۔ طفلے کہ خوش نخاورد افسانہ نی ست

خط کہ وظاہر آں دہن غنچہ رنگ را ۔۔۔ در کار بود حاشیہ این متن تنگ را

بر صوفی بے وجد و بال است عبادت ۔۔۔ بر شیشہ کہ خالی ست زمے سجدہ حرام است

ریخت کافر بچۂ خون مسلماں را ۔۔۔ یاد آں روز کہ من نیز مسلماں بودم

سبب چاک گریبان من خستہ مپرس ۔۔۔ کہ شب غم با اجل دست و گریباں بودم [2]

[1] آثار الکرام ج ۱ ص ۲۰۳، وسبحۃ المرجان ص ۵۴، [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴۹،

علمی کمالات اور جامعیت

ملا محمود کے علمی و فنی تبحر کے بارے میں ان کے تذکرہ نویسیوں اور دیگر اہل علم و فن کے اقوال و تاثرات پہلے بیان ہو چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں عبقریت و امامت کا درجہ رکھتے تھے، اور عرب و عجم میں کوئی شخص علوم و فنون کی جامعیت خاص طور سے حکمت و ادب میں انکا کوئی ہمسر نہ تھا، وہ ان دونوں علوم میں بیکوقت میر سید شریف جرجانی و شیخ عبد القاہر جرجانی رازی و دوانی اور سکاکی و تفتازانی تھے اور کہنے والوں نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے فلسفہ اور حکمت میں ملا محمود جیسا کوئی عالم پیدا ہی نہیں ہوا، ملا صاحب کے علمی کمالات کا اندازہ کرنے کے لئے اگر حکمت و فلسفہ کے ساتھ ادب و بلاغت کا ذوق بھی ہو تو ان کی دونوں کتابوں یعنی شمس بازغہ اور فرائد کا مطالعہ کرنا چاہئے ان کے اقران و معاصرین میں سے کسی کو ان کی کسی کتاب پر اور اس کی عبارت پر انگلی اٹھانے کی جرارت نہ ہوئی، البتہ بعض اہل علم نے شمس بازغہ کے مقدمہ کی اس عبارت

سودت کثیرا من مباحث ما قبل الطبیعۃ وبقی اکثر واملیت من مطالب ما بعد الطبیعۃ الاقل الاندر

میں نے ما قبل الطبیعات کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کر لیا، مگر اس کا اکثر حصہ رہ گیا تھا اور ما بعد الطبیعات کے چند مسائل کا املا کرایا تھا،

پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ملا صاحب نے ما قبل الطبیعیات کے مباحث کو فن طبیعات میں شمار کیا ہے، حالانکہ ما قبل الطبیعات اور ما بعد الطبیعیات کے مسائل فن الٰہیات

کے ساتھ مخصوص ہیں، مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے شرح مواقف کے حواشی میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ ملا صاحب کا ما قبل الطبیعہ کو طبیعات میں شمار کرنا فلاسفہ اور حکماء کی عرف و اصطلاح کی رو سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت طبیعات کے مباحث فن الٰہیات ہی سے متعلق ہیں، مگر مرتبہ کے لحاظ سے طبیعات کی بحث الٰہیات کی بحث سے پہلے ہے اس اعتبار سے قبل الطبیعیات کی بحث فن طبیعیات سے متعلق ہے، [1]

ملا صاحب کا دوسرا شاہکار الفرائد اور اس کا حاشیہ ہے جس سے ادب اور فصاحت و بلاغت میں تبحر کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا غلام علی آزاد کی شہادت ہے،

وعلق علیہ حاشیۃ احسن فیھا کل الاحسان وھو شرح جلیل القدر یعرف منہ تبحرہ فی علوم الفصاحۃ طالعتہ کثیرا ووجدتہ علی ریاض الادب سحابا ماطرا [2]

ملا صاحب نے اپنی شرح الفرائد پر خود حاشیہ لکھا جس میں پورا حسن و جمال بھر دیا ہے، یہ حاشیہ جلیل القدر شرح ہے جس سے علم فصاحت و بلاغت میں ان کے تبحر کا پتہ چلتا ہے، میں نے متعدد بار اسکا مطالعہ کیا ہے اور اسے ادب کے چمن پر برستا ہوا بادل پایا ہے،

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں:-

وعلق علیہ حاشیۃ حجمھا اکثر من حجم شرحہ. واتی فیہ بعجائب

ملا صاحب نے فرائد پر حاشیہ لکھا ہے جس کا حجم فرائد سے زیادہ ہے اس میں

---

[1] ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ، [2] سبحۃ المرجان ص ۵۳،

تنشط بها الاذهان، وتفرح بسماعها الاذان، ۱ه — انھوں نے ایسی عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں جن سے ذہنوں کو نشاط اور کانوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے،

امراض کا ہجوم

ملا محمود کی پوری زندگی عیش وتنعم میں گذری تھی، ان کے پدری و مادری خانوادے پشتہا پشت سے شاہی نوازشوں سے بہرہ ور تھے، وہ اگرچہ بارہ سال کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہوگئے تھے مگر نانا کی شفقت ومحبت سے نہایت آرام سے بچپن کے دن گذارے، اٹھارہ سال کی عمر میں فراغت کے چند ہی سال بعد شاہجہاں اور امرائے دولت کی قدردانی نے ان کو دربار شاہی میں پہونچا دیا، مستقل منصب وظیفہ اور جاگیر کے علاوہ مختلف تقریبات میں علیحدہ انعامات ملتے تھے جس سے انکی زندگی بڑی فراغت اور عیش سے بسر ہوتی تھی، مگر آخر میں ان کو امراض واسقام کے ہجوم نے گھیر لیا جس سے ان کے تعلیمی وتصنیفی مشاغل میں خلل پیدا ہونے لگا، خاص طور سے شمس بازغہ کی تصنیف کے زمانہ میں شدید مرض میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے کتاب کے بعض مباحث پر بعد میں مستقل کتاب لکھنی پڑی، شمس بازغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک عمدہ متن اور اس کی نفیس شرح لکھنی شروع کی متن کا نام الحکمۃ البالغہ اور شرح کا نام الشمس البازغہ رکھا، مگر تالیف وتصنیف میں چیونٹی کی چال چلتا تھا اور زمانہ میری موت کو قریب کرنے کے لئے دوڑ رہا تھا، اسی درمیان میں ماقبل الطبیعیہ کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کر لیا، پھر بھی اکثر وبیشتر مباحث رہ گئے اور مابعد الطبیعۃ کے کچھ مسائل لکھے گئے کہ اچانک

۱ه ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ،

خطرناک مرض کا حملہ ہوگیا جس نے کوچ کا طبل بجا دیا، اس وقت ماقبل الطبیعۃ کی بحث کا جو مسودہ تیار کیا، ہمارے مقررہ معیار کے تقریباً مطابق تھا اور مابعد الطبیعیۃ کے جو مباحث لکھے تھے وہ بھی اس کتاب کے معیار کے قریب تھے، چنانچہ میں نے ان ہی پر ابواب قائم کئے، البتہ مابعد الطبیعہ کے کچھ مسائل ایک دوسرے سے متعلق تھے اور ان کے نظم وترتیب کے لئے وسعت درکار تھی، اس لئے جو مباحث مبادی اجسام سے تعلق رکھتے ہیں ان کو میں نے ایک علیحدہ رسالہ میں بیان کیا ہے جسکا نام "الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ" ہے ۱ه اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمس بازغہ جیسی عظیم کتاب کی تصنیف کے وقت ملا صاحب کا حال یہ تھا کہ

کنت ادبّ فی التالیف دبیباً، وان الدھر فی تقریب حمامی ارقالاً وتقریباً،

اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ ھجم المرض الوبیل وضرب علی طبل الرحیل،

معلوم نہیں مرض کا یہ ہجوم وقتی تھا یا مزمن ثابت ہوا، البتہ ملا صاحب کے بیان سے اسکی شدت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

وفات ۱۰۶۲ھ

ملا محمود کی وفات جونپور میں ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ میں ہوئی، ماثر الکرام میں ہے رحلت ملا محمود نہم ربیع الاول سنۃ اثنتین وستین والف (سنۃ ۱۰۶۲ھ) اتفاق افتاد (ص ۲۰۳) اور سبحۃ المرجان (ص ۵۳)، تجلی نور (جلد ۲ صفحہ ۱۸) اور تذکرہ علمائے ہند (صفحہ ۲۲۱) میں بھی یہی ہے، البتہ تذکرۃ العلما صفحہ ۴۸ میں صرف ۱۰۶۲ھ ہے تاریخ وماہ درج نہیں ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ عین شباب میں وفات ہوئی جو خلاف واقعہ ہے، نزہۃ الخواطر جلد ۵ صفحہ ۳۹۹ میں بھی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ ہے، ان تصریحات کے علی الرغم ہمارے استاذ الاستاذ مولانا محمد شریف مصطفےٰ آبادی نے الافاضۃ القدسیۃ

۱ه شمس بازغہ ص ۲

فی المباحث الحکیمہ کے مقدمہ ص ۱۶ میں ملا صاحب کی وفات ۱۰۳۲ھ میں درج کی ہے جو سراسر خلاف واقعہ ہے، ملا صاحب کی ولادت رمضان ۱۰۱۵ھ میں اور وفات ربیع الاول ۱۰۶۲ھ میں ہوئی، اس حساب سے ان کی عمر وفات کے وقت ۴۷ سال کی تھی، اس لئے نہ عین شباب تھا اور نہ شباب ہی تھا، اور اگر تجلی نور اور نزہتہ الخواطر کی روایت کے مطابق ان کی ولادت ۹۹۳ھ میں مان لی جاتے تو مدت عمر ۶۹ سال ہوگی، مگر پہلا تخمینہ صحیح ہے۔

ملا صاحب کی وفات علم وفن کی وفات تھی اس لئے ارباب علم وفن میں آپ کا بڑا ماتم ہوا، ان کے استاد ملا افضل کو اپنے شاگرد رشید کی وفات پر اسقدر رنج وغم ہوا کہ چالیس دن تک ان کے لب پر مسکراہٹ نہ آسکی اور اس غم میں وہ بھی انتقال فرما گئے، کہنے والے نے استاد وشاگرد کی موت پر یہ تاریخ وفات کہی،

"زمحمود وافضل بگو آہ آہ" [1]
۱۰۶۲ھ

تجلی نور کے مصنف سید نور العین زیدی ظفرآبادی نے ملا صاحب کی وفات پر یہ تاریخی اشعار لکھے ہیں،

دریغا ز دنیائے ناپائدار	سفر کرد محمود عالی تبار
تہی شد زمانہ ز علم وہنر	بجز جاہلے نیست کے غمگسار
زمیں گرد شد، آسمان نیلگوں	سیہ گشت گیتی جہاں سوگوار
رگ ابر را اشکباری ہنوز	دم برق در مانمش بے قرار
بس اے زیدی دل حزیں بس خموش	بقا ذات باری جہاں بے مدار

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۳، تذکرۃ العلماء ص ۴۸، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۱،

یکے آمد و دیگرے می رود	ہمیں ست ہنجار لیل ونہار
ترا شید روئے بقا بہر سال	بیفزود و دور ابد و چار چار

ملا صاحب اپنے مولد ومنشا اور مدفن جونپور کے محلہ چاچک پور میں دفن کئے گئے، جہاں انکا پختہ مزار موجود ہے، اور ان کی اولاد بھی وہاں آباد ہے [1]

ملا محمد دائم بن ملا محمود | ملا صاحب کی ایک صلبی اولاد کے علاوہ کسی کا تذکرہ ابتک نظر سے نہیں گذرا ملا محمد دائم قادری جونپوری کے بارے میں صاحب تجلی نور نے تصریح کی ہے کہ از اولاد ملا محمود جونپوری است، اور لکھا ہے کہ انھوں نے علوم متداولہ وفنون رسمیہ کی تحصیل اپنے دیار کے علماء سے کی تھی، اور اپنی ذہنی استعداد اور فکری قوت کی وجہ سے تھوڑی مدت میں علم وفضل میں کمال پیدا کر کے عقلی ونقلی علوم میں شہرت کے مالک ہوگئے، ابتدا میں درس وتدریس کا مشغلہ رکھتے تھے مگر آخر میں علائق دنیا سے الگ ہو کر گوشہ نشین ہوگئے تھے، رات دن میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے، صائم الدہر اور قائم اللیل تھے، صرف ظہر کی نماز کے لئے حجرہ سے باہر آتے تھے، نماز کے بعد تھوڑی دیر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے، سلسلۂ قادریہ کے مشائخ اور دوسرے سلاسل کے درویشوں کی نسبت کے آثار وبرکات ان پر نمایاں تھے، جونپور میں وفات پائی، تاریخ وفات اور مدفن کی تحقیق نہیں ہوسکی [2]۔ ملا صاحب کی اولاد میں بعد میں بھی علماء وفضلاء پیدا ہوئے،

تلامذہ | ملا محمود نے ۱۰۳۲ھ سے ۱۰۶۲ھ تک کی زندگی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کی، اس تیس سالہ درس میں صدہا تلامذہ ان کی درسگاہ سے فارغ

[1] تجلی نور ص ۱۵، [2] ایضاً ج ۲ ص ۵۲،

ہوئے، ان کی علمی شہرت سے دور دور سے طالبانِ علم ان کی خدمت میں آے
اور ان کے خزانہ علم سے اپنا اپنا حصہ لے کر واپس ہوگئے، ان کے شاگردوں میں
بادشاہ شاہجہان، شاہزادہ محمد شجاع اور وزراء و امراء میں آصف خاں، شائستہ
خاں، سعد اللہ خاں جیسے اربابِ جاہ و حشم بھی شامل ہیں، ان میں ایک بڑی تعداد
ان سے فیضیاب ہوئی ہے، ان میں چند مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

ملا محمد باقی جونپوریؒ ملا محمد باقی بن مفتی ابو البقا بن ملا محمد درویش جونپوری ابتدائی
دور میں زہد و تصوف کی طرف مائل تھے، مگر بعد میں ملا محمود کی خدمت میں آکر
تحصیل علم کی اور سرتاج علمائے عظام اور سراج حکمائے اسلام بن گئے، ملا صاحب
نے ان کی ذکاوت و ذہانت کی بنا پر خصوصی توجہ فرمائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ،

بہ اندک زمانا از ابتدا رتا انتہا چنان
رسانید کہ از مرتاضانِ شاگردانِ
ملا محمود گشت،

ملا صاحب نے ان کو تھوڑے زمانہ
میں ابتدا سے انتہا تک یوں تعلیم
دیدی کہ وہ ان کے مخصوص و ممتاز
تلامذہ میں شمار کئے گئے،

ملا محمد باقی تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے، مگر ریاضی اور حکمت میں امتیازی
مقام رکھتے تھے، ان کی گفتگو اور خطابت میں بڑا زور تھا، اپنی شیریں بیانی اور
طاقت لسانی سے سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتے تھے، ان کے کمالات کی وجہ
سے ان کا لقب "فاضل جونپوری" پڑ گیا تھا، اور انھوں نے اپنے استاد کے اشارہ
پر الآداب الباقیہ اور الابحاث البقیہ دو کتابیں دیوان محمد رشید کی شرح
شریفیہ کے مقابلہ میں لکھی تھیں، اور استاد کے وصال کے بعد ان کی جگہ تدریس

و افادہ کی خدمت انجام دی، جہانگیر نے ان کو ایک گاؤں جاگیر میں دیا
تھا، جس سے ہر سال آٹھ نو روپیہ کی آمدنی ہوتی تھی، ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۶۶ھ
میں وفات پائی، ان کی قبر جونپور کے محلہ گنج میں منشی امام بخش کی مسجد کے
شمال میں بلندی پر موجود ہے، نزہۃ الخواطر میں ان کا نام عبد الباقی بن غوث
الاسلام صدیقی جونپوری ہے[1]

ملا شیخ محمد صادق بروفوی جونپوریؒ ملا محمد صادق بن شمس نور بروفوی جونپوری
نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار مفتی شمس نور سے حاصل کی، باقی کتابیں ملا
محمود سے پڑھ کر ان کی درسگاہ سے سند فراغ پائی، اور والد کے انتقال کے بعد
ان کی جگہ مفتی اور ان کے مدرسہ کے مدرس ہوئے، عالم باعمل اور زہد و تقویٰ
میں یکتا تھے، طبیعت میں توکل اور فقر و استغنا تھا، دنیا اور اہل دنیا سے دور
رہتے تھے، ایک مرتبہ ملا رکن الدین بحریابادی غازی پوری امیر الامراء نواب
شائستہ خاں کی ملازمت کے زمانہ میں وطن آئے تو نہایت قیمتی شال ملا محمد صادق
کی خدمت میں پیش کر کے حق استاد زادگی ادا کرنا چاہا، ملا صاحب نے یہ کہہ کر
اسے واپس کر دیا، "من دلق را بہ اطلسِ شاہان نمی خرم"، فقیر را گلیم بس است
لائق شال خود را نمی انگارم"

ایک مرتبہ حاکم جونپور نواب اللہ وردی خاں نے کوئی بات لکھی جو از
روئے شریعت غلط تھی، اور اس کو مفتی محمد صادق کی خدمت میں مہر تصدیق
ثبت کرنے کے لئے بھیجا، ملا صاحب نے صاف انکار کر دیا، اس کے بعد

۱؎ تجلی نور ج ۲ ص ۶۶، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۹۵۔

الہ وردی خاں نے سیر دریا کے بہانے آپ کو کشتی پر سوار کیا، جب کشتی بیچ دریا میں پہونچی تو مفتی محمد صادق سے کہا کہ اگر میری تحریر پر مہر نہیں کریں گے تو ابھی آپ کو دریا میں پھینک دونگا، ملا صاحب نے ہنسکر کہا کہ اس جبر و کراہ کی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور انگوٹھی نکال کر الہ وردی خاں کو دے دی، اس نے بار بار مہر لگائی مگر اس کا نشان ظاہر نہ ہوا، آخر میں شرمندہ ہو کر معذرت خواہ ہوا،

ملا محمد صادق بھاری بھر کم جسم کے تھے اس لئے امامت سے حتی الامکان بچتے تھے، اور دوسرے کو آگے بڑھاتے تھے، ایک دن ان کے استاد ملا محمود نماز کے وقت تشریف لائے اور امامت کے لئے آگے بڑھے مگر استاد ہونے کے باوجود ملا محمد صادق نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا، اور خود امامت کی، فارغ ہونے کے بعد دست بستہ شفیق استاد کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، کہ حضرت! میں حتی الامکان امامت نہیں کرتا ہوں مگر مجھے حکمار و فلاسفہ کے کلام میں ایمان مشتبہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں نے نماز ضائع نہیں کی، بلکہ خود ہی امامت کر دی "در کلام حکما، شبہہ ایمان میدادم بہر ایں نماز خود را ضائع نمودم" ملا محمود شاگرد رشید کے اس متقیانہ اقدام سے بیحد خوش ہوئے اور فرمایا، کہ "الحمد للہ از شاگردان خود یک عالم باعمل و مرد زاہد یافتم"

ملا محمد صادق کی وفات ۱۴ر ذوالحجہ ۱۰۶۴ھ میں ہوئی، ان کی قبر جونپور کے محلہ مفتی میں املی کے درخت کے نیچے موجود ہے، شمالی چبوترہ پر پہلی بڑی پختہ قبر انہی کی ہے، پہلے اس علاقہ کو چند پور کہتے تھے، ان کی تاریخ وفات "عالم فاضل بود" ہے،[1]

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۸۴، ۸۵

ملا عبدالجلیل بردنوی جونپوری

ملا عبدالجلیل بن ملا شمس نور بردنوی جونپوری ملا محمد باقی کے بھائی ہیں، انھوں نے تمام کتب درسیہ من اولہ الی آخرہ اپنے والد ملا شمس الدین بن نور الدین سے پڑھیں اور بعض مشکل مسائل میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید سے استفادہ کیا، "و بعض بعض مشکلات مسائل را پیش ملا محمود راست نمود" تمام علوم متداولہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور نہایت محققانہ انداز میں درس دیتے تھے، زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے، عام طور سے مسلسل روزہ رکھتے تھے، اور پوری رات عبادت و ریاضت میں گذارتے، ان کو شاہ عبدالجلیل لکھنوی اور شیخ عزیز الحق دہلوی سے ارادت و خلافت حاصل تھی، ۸ر شوال ۱۰۷۶ھ میں انتقال ہوا، ان کا مزار جونپور میں ملا محمد صادق کے مزار کے برابر ہے،[1]

مولانا عطاء اللہ اصفہانی گھوسوی

مولانا شیخ عطاء اللہ بن قاضی حبیب اللہ عثمانی اصفہانی گھوسوی ملا محمود کے آبائی وطن کے قریب گھوسی کے رہنے والے تھے، ان کے والد قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسوی میر علی عاشقان سرائمیری کے خلفاء میں تھے، مولانا عطاء اللہ گھوسی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے، ملا محمود اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کر کے شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جونپوری سے طریقت حاصل کی، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کے مشاہیر علماء میں تھے، نہایت متقی اور دیندار عالم تھے، ۵ر ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے،[2] ان کے صاحبزادے شیخ غلام نقشبندی گھوسی لکھنوی، متوفی ۱۱۲۶ھ مدفون لکھنؤ تھے جو اپنے زمانہ میں کبار علماء و اساتذہ میں سے تھے،

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۸۵، [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷۴،

قاضی عبد الرحمن کمال پوری مولانا قاضی عبد الرحمن بن ابراہیم بن یوسف کمال پوری اپنے دور کے علمائے کبار میں تھے، ان کے اساتذہ میں ملا محمود بھی شامل ہیں، علوم وفنون ملا صاحب وغیرہ سے حاصل کر کے شیخ فتح قلندر سے طریقت حاصل کی، مقام سکدی کے قاضی تھے، فارسی اور عربی زبان میں انکی متعدد تصانیف ہیں، عربی میں رموز المعارف، اور فارسی میں قصص الاسرار، تلقین، وجدانی، فارسی میں ان کے اشعار بھی ہیں،[1]

تصانیف ملا محمود ہندوستان کے ان علماء میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کی استعداد سے بھی نوازا تھا، وہ صاحب تلامیذ کثیرہ کی طرح صاحب تصانیف کثیرہ بھی تھے، سترہ سال کی عمر میں فارغ ہونے کے بعد سے وفات تک پوری زندگی اسی جامعیت کے ساتھ بسر کی۔ مآثر الکرام میں ہے،

ودر عرض ہفدہ سالگی فاتحۂ فراغ خواندہ کمیت قلم در میدان تصنیف جولان داد، وشمس بازغہ در حکمت و فرائد در فن بلاغت املا کرد،[2]

سترہ سال کی عمر میں فارغ ہوئے اور قلم کے شہسوار بنکر تصنیف کے میدان میں جولانی دکھاتے رہے، حکمت میں شمس بازغہ اور بلاغت میں فرائد جیسی کتابیں لکھیں،

یہی سبحۃ المرجان صفحہ ۵۳ میں بھی ہے، مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے بھی یہی نقل کیا ہے، یوں تو ملا صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں اور مختلف فنون میں خامہ فرسائی کی مگر

[1] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۴۰، [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲،

ان میں دو کتابیں ان کے علم وقلم کا شاہکار ہیں، تجلی نور میں ہے:-

ونقاد علمائے اشراقیین وسالک حکمائے مشائین گشت، کتاب شمس بازغہ در حکمت و فرائد کہ بفن بلاغت املا کرد، دال برین منوال است،[1]

فن حکمت وفلسفہ میں شمس بازغہ اور فن بلاغت میں فرائد، ان کی یہ دونوں کتابیں، انکی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

۱- الفرائد فی شرح الفوائد ملا صاحب کی یہ کتاب اور اس کا حاشیہ دونوں ان کے ذوق ادب وبلاغت کا مظہر ہیں، انھوں نے یہ کتاب جوانی کے ایام میں لکھی اور اپنے جوان فکر وجوان علم وقلم سے پورا کام لیا، یہ کتاب الفوائد الغیاثیہ کی شرح ہے جو مشہور متکلم امام قاضی عضد الدین ایجی متوفی ۷۵۶ھ کی تصنیف ہے، قاضی عضد الدین ایجی سے وزیر غیاث الدین بن رشید الدین متوفی ۷۳۶ھ نے فن بلاغت کی مشہور کتاب المفتاح کی تلخیص وتحریر کی خواہش کی، وزیر غیاث الدین علم اور اہل علم کا بڑا قدر دان تھا، بہت سے علماء ومصنفین نے اس کے نیک نام سے اپنی کتابیں منسوب کی ہیں، چنانچہ قاضی عضد الدین ایجی نے بھی اپنی اس کتاب کا نام اسی کے نام پر رکھا، ملا محمود، ادب وبلاغت کے شیدائی تھے، ان کو اپنے ذوق کے لئے اس فن کی کسی معیاری کتاب کی تلاش تھی، آخر انکی نگاہ انتخاب الفوائد الغیاثیہ پر ٹھہری، اور اسکی بہترین شرح الفرائد فی شرح الفوائد کے نام سے لکھی اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے بادشاہ اور علم وعلماء کے قدرداں شاہجہاں کی نذر کی، ملا صاحب نے

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰،

مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف شروع کرتے ہی سفر درپیش ہوگیا اور کام چھوٹ گیا، چند سال کے بعد وطن واپسی ہوئی تو پھر کام شروع کیا، مگر اختتام سے پہلے پھر سفر پیش آگیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسی پر کتاب ختم کرنی پڑی (صفحہ ۵) یہ سفر دہلی لاہور اور آگرہ وغیرہ کے تھے، جو شاہی دربار کی علمی اور دینی ضرورت پر ہوتے تھے،

الفرائد کا ایک حاشیہ فارسی میں راقم کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری متوفی ۲۶ رجب ۱۳۵۹ھ نے قیام ڈھاکہ کے دوران میں القلائد من الفرائد کے نام سے لکھا ہے جو الفرائد کے ساتھ ۱۳۳۸ھ میں چھپا ہے، یہ حاشیہ پہلے عربی زبان میں شرح کے انداز میں لکھا گیا ہے، مگر بعد میں طلبہ کی آسانی کے خیال سے مختصر کر کے فارسی میں لکھا گیا، عربی شرح کا نام سمط الفرائد تھا اور اس کا خطبہ مولانا مرحوم نے اپنے استاذ مولانا محمد طیب عرب کی متوفی ۱۳۳۵ھ کی خدمت میں جب وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی ادب کے مدرس تھے، بغرض اصلاح پیش کیا تھا، انھوں نے یہ لکھکر خطبہ واپس کر دیا تھا کہ واما الخطبۃ فلا تحتاج الی اصلاح یہ خطبہ جو نظم ونثر دونوں پر مشتمل ہے مولانا مرحوم کے عربی دیوان میں موجود ہے،

حاشیۃ الفرائد ملا صاحب نے الفرائد فی شرح الفوائد لکھنے کے بعد خود اس کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا جس کے متعلق علماء نے شاندار توصیفی الفاظ لکھے ہیں، سبحۃ المرجان میں مولانا غلام علی بلگرامی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے فرائد کے حاشیہ میں نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی سے کام لیا ہے، یہ حاشیہ درحقیقت بڑی شرح ہے جس سے ملّا صاحب کا علم وفصاحت میں تبحر معلوم ہوتا ہے، میں نے اس کا مطالعہ بار بار کیا ہے،

یہ کتاب گلستان ادب کے لئے ابر باران ہے[1]، مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے فرائد پر حاشیہ تحریر کیا جو اصل کتاب سے بہت زیادہ ہے، اس میں خوش کن عجائب بیان کئے ہیں جن سے ذہنوں کو نشاط اور کانوں کو فرحت ہوتی ہے،

۲- الشمس البازغۃ ملا صاحب کی اہم ترین تصنیف شمس بازغہ ہے جو ان کے معقولاتی علوم وفنون کا شاہکار ہے، اس کو ایسے وقت میں لکھا تھا جب امراض واسقام کا بے پناہ ہجوم تھا، اور صحت وتندرستی تقریباً جواب دے چکی تھی، مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب شمس بازغہ میں جملہ علوم طبعیہ کو بیان نہیں کر سکے کیوں کہ ان کی عمر طبعی کے کوچ کا طبل بج گیا تھا، ملا صاحب نے خود اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں اس کتاب کی تصنیف میں چیونٹی کی چال چلتا تھا، اور زمانہ میری موت کے قریب لانے میں دوڑ رہا تھا، ما قبل الطبیعیات کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کر کے اور باقی مسائل کو چھوڑ کر ما بعد الطبیعیات کے کچھ مطالب لکھے تھے کہ مرض کا حملہ ہوگیا اور ان مباحث کی تکمیل حسب منشا نہیں ہو سکی، ان ہی مبادی اجسام کے مباحث بھی تھے، جن کے لئے "الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ" کے نام سے ایک الگ رسالہ لکھا، اس کتاب میں ملا صاحب نے الحکمۃ البالغۃ کے نام سے متن لکھ کر الشمس البازغۃ کے نام سے اس کی شرح کی ہے، قُلتُ کہکر متن کی عبارت لکھی ہے، اور اقول کہکر اس کی شرح کی ہے، الدوحۃ المیادۃ کے علاوہ متعدد مباحث جو شمس بازغہ میں نہیں آسکے تھے ملا صاحب نے ان کو الگ الگ رسالے کی شکل میں مرتب کیا تھا، یہ سب مطبوعہ شمس بازغہ کے آخر میں موجود ہیں،

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۵۳ ،

اسی لئے ان کے سوانح نگاروں نے ایسے رسائل کو الگ تصنیف نہیں شمار کیا ہے مگر بعض متاخرین نے ان کو مستقل کتاب قرار دیا ہے، چنانچہ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب کی تصانیف میں سے الدوحۃ المیادۃ، رسالہ کلی وجزئی، رسالہ تحقیق اجتماع نقیضین وارتفاع نقیضین بھی ہیں جن سے غلام علی آزاد بلگرامی ناواقف تھے، ہمارے نزدیک آزاد کے ان رسائل کو ذکر نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ان کو شمس بازغہ کے مباحث قرار دیتے تھے، شمس بازغہ صرف حکیمانہ وفلسفیانہ مباحث اور تحقیقات ہی کی بے مثل کتاب نہیں ہے بلکہ زبان وادب کے اعتبار سے بھی اس کا معیار بہت بلند ہے، حالانکہ عام طور سے حکماء وفلاسفہ کی عبارتیں ادبی ذوق سے عاری اور فنی معیار سے خالی ہوتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اصل چیز مفہوم ومعنی ہیں، لفظ و عبارت کی حیثیت صرف ذریعہ اور وسیلہ کی ہے، اس لئے ان کے یہاں اسکا اہتمام نہیں ہوتا ہے، مگر ملا صاحب حکمت وادب اور لفظ ومعنی دونوں کے جامع تھے، آخری دور میں علمائے خیرآباد میں یہ وصف پایا جاتا تھا کہ وہ منطقی وفلسفی ہونے کے ساتھ ادب وعربیت کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جاسکتا ہے، ہمارے مدارس میں اب سے تیس چالیس سال پہلے تک صدرا اور شمس بازغہ کا رواج تھا، اور ہم نے بھی انکو پڑھا ہے مگر اب تو ان کتابوں کے نام بھی مدارس عربیہ میں زبانوں پر نہیں آتے، شمس بازغہ اور ملا محمود دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک کے ساتھ دوسرے کے ذکر کی دلالت التزامی ضروری ہے،

۳- الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ ملا صاحب نے اپنی اس کتاب کا تعارف شمس بازغہ کے مقدمہ میں خود کرایا ہے،

الا ان جملۃ منہا کانت متعانقۃ متسعۃ النظام، وھی المباحث المتعلقۃ بمبادی للاجسام جلتھا رسالۃ مفردۃ موسومۃ بالدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ،	مابعد الطبیعیات جو مباحث مبادی اجسام سے تسلسل کے ساتھ متعلق تھے انکو میں نے اس رسالہ میں بیان کرکے اسکا نام الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ، رکھا ہے،

ملا صاحب نے شاہجہاں کے دربار میں ملا کج ایرانی سے مناظرہ اور کامیابی کے بعد اثبات ہیولی کے دلائل کے سلسلے میں اس رسالہ کو لکھ کر دیا تھا، یہ رسالہ شمس بازغہ کے آخر میں موجود ہے جو بسم اللہ کے بعد "فصل فی اثبات الہیولی" سے شروع ہوتا ہے، اور یہ بھی شمس بازغہ کی طرح متن اور شرح پر مشتمل ہے،

۴- رسالہ فی الکلی والجزئی یہ رسالہ بھی درحقیقت شمس بازغہ کے مباحث کا تکملہ وتتمہ ہے، مطبوعہ شمس بازغہ کے آخر میں الدوحۃ المیادۃ کے بعد بسم اللہ سے یہ رسالہ شروع ہوتا ہے، اور اسمیں بھی قلت سے متن اور اقول سے شرح ہے،

۵- رسالہ ارتفاع النقیضین شمس بازغہ کے آخر میں رسالہ کلی وجزئی کے بعد رسالہ ارتفاع النقیضین ہے، یہ بھی اسی طرح متن اور شرح پر مشتمل ہے، مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی نے اس کا نام رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما لکھا ہے،

۶- رسالہ فی وحدت الوجود اسکا تذکرہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے کیا ہے،

۷- رسالہ تحقیق قضا وقدر یہ رسالہ قضا وقدر کی تحقیق میں فارسی زبان میں ہے جیسا

کہ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے لکھا ہے، اس کا اردو میں ترجمہ سرشاہ سلیمان نے الہ آباد میں ایک عالم سے کرایا تھا، جس پر مولانا محمد شریف صاحب مصطفےٰ آبادی صاحب الافاضہ القدسیہ نے تعاقب لکھ کر دوسرے کے نام سے شائع کیا تھا، مولانا اس زمانہ میں مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں صدر مدرس تھے،

۸۔ رسالہ اقسام نسواں | یہ چار ورق کا مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے جو بقول مولانا غلام علی آزاد فن نائکا بھید میں ہے، اور اس میں عورتوں کے اقسام بیان کئے گئے ہیں، یعنی باعتبار سن وسال اور بلحاظ درجات عمر و مراتب الفت عورتوں کی مختلف قسمیں اور ان کے الگ الگ نام ہیں، ملا صاحب کے اکثر تذکرہ نویس ان کی اس مختصر سی کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں،

(۹-۱۰) صاحب تجلی نور نے ملا صاحب کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ "دو دیوان فارسی دارد، یکے دیوان شعرا، دوییں مستند شعراء، ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں کتابوں میں شعراء کے مختلف اشعار اور اُنکے مستند حالات ہونگے، جن میں ملا صاحب نے اپنے اشعار وحالات بھی درج کئے ہوں گے،

(۱۱) ملا صاحب نے اپنے مرشد شیخ نعمت اللہ فیروزپوریؒ کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف کو ایک الگ رسالہ میں جمع کیا تھا، جس کو مولانا خوب اللہ محمد یحیٰ الہ آبادی نے وفیات الاعلام میں نقل کر دیا ہے،،

حیاتِ شبلی:۔ مولانا شبلی کی بہت مفصل سوانح عمری جسکے مقدمہ میں دیار شرق کے علماء و فضلا کیسا تھ شمس بازغہ کے مشہور مصنف ملا محمود کا ذکر بھی اجمال کے ساتھ آیا ہے، یہ فاضلانہ مضمون اس کی تفصیل ہے،

قیمت ۱۷ روپیہ

قرآنِ پاک اور مرزا غالب

از

جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ

ڈاکٹر اصفہانی فخر الزماں کا جو مضمون "غالب کا مذہبی رجحان ان کے کلام کی روشنی میں" کے عنوان سے مارچ اور اپریل کے معارف میں شائع ہوا تھا، اس پر پروفیسر مسعود حسن نے تعقب کیا ہے، راقم نے ڈاکٹر اصفہانی کے مضمون پر حسب ذیل نوٹ لکھا تھا،

(۱) مضمون نگار نے غالب کے مذہبی رجحان اور آیات قرآنی پر ان کی نظر کے ثبوت میں ان کے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں آیات قرآنی کے متعلق اس قسم کی تلمیحات اسقدر عام ہیں کہ ان سے کم و بیش ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے اور انسے کسی مسلمان شاعر کا کلام خالی نہیں نکل سکتا[۱] اس لئے یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی وسعتِ نظر کا ثبوت ہے اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈھ نکالے اور ان سے متعلق آیات پیش کر دیں اب تک کسی نے اس حیثیت سے کلام کا مطالعہ نہیں

---

[۱] بلکہ ہندو شعراء کے کلام میں بھی اس قسم کی تلمیحات ملتی ہیں۔

کیا تھا"

اس نوٹ سے غالب کی قرآن دانی کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے مگر اس مضمون میں کلام غالب کے ایک ایسے پہلو کو دکھایا گیا تھا جس کی جانب کسی نے توجہ نہیں کی تھی، اس لئے اس کو شائع کر دیا گیا ہے۔

شاعری کی دنیا حقیقت سے بالکل الگ ہے، اس لئے کسی ایسے شاعر کے کلام سے جو صاحب پیام نہ ہو یعنی جسکا مقصد کسی نظریہ اور مشن کی تبلیغ نہ ہو اسکے ذاتی عقائد پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے پھر اردو اور فارسی شاعری کی زبان ایسی ہے کہ اگر اس کو شاعر کے عقیدہ کی بنیاد قرار دیدیا جائے تو بہت سے عارف باللہ شعراء رند شاہد باز اور رند مشرب دنیدار نظر آئیں گے، یہی غلطی ڈاکٹر اصفہانی کے مضمون میں تھی، غالب کے مذہبی رجحان کے ثبوت میں ان کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا تھا اور اس سلسلہ میں انھوں نے بعض اکابر شعراء کے متعلق ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہیں جو صحیح نہیں ہیں، اسی طریقہ سے بعض شعراء مذہب کے متعلق بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے مذہب کے استخفاف و استہزا کا پہلو نکلتا ہے، حالانکہ اس کا مقصود استخفاف نہیں ہوتا، بلکہ صرف شاعرانہ شوخی ہوتی ہے۔ جس سے حافظ جیسے عارف کا کلام بھی خالی نہیں ہے اس لئے ایسے اشعار سے شاعر کی بدعقیدگی پر استدلال صحیح نہیں ہے، درحقیقت غالب ایک رند مشرب شاعر تھے، ان کو دیندار یا بے دین کے لباس میں پیش کرنا ہی صحیح نہیں ہے وہ نہ مرد مومن تھے اور نہ خارج از اسلام، عقیدۃً وہ مسلمان تھے، اور عملاً رند مشرب، انکی رندی پر ان کی پوری زندگی شاہد ہے اور ان کے عقائد کا ثبوت ان کے توحید و رسالت و حمد و نعت کے فارسی قصائد ہیں،

جو محض شاعری نہیں بلکہ ان کے دلی جذبات کے صحیح ترجمان ہیں۔

غالب کی عبقریت، فارسی زبان پر ان کی قدرت، شاعری میں خیالات کی ندرت اردو نثر نگاری میں جدت مسلم ہے لیکن اس زمانہ کے ادیبوں نے انکے بارہ میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے، ان کے کلام.... اور ان کی زندگی سے وہ نکتے ڈھونڈھ نکالے ہیں اور ایسے ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھے، چنانچہ اس کو بہت بڑا ترقی پسند، قوم پرور، متحدہ قومیت کا حامی، آزادی کا علم بردار، کمیونسٹ اور خدا جانے کیا کیا بنا ڈالا جن کا اس زمانہ میں تصور تک نہ تھا، وہ غریب اپنی پنشن کے لئے "صاحبان والا شان" کی شان میں بڑے ... لمبے لمبے قصیدے لکھتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اپنی شرکت سے برابر تبرا کیا کرتے پھرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے سارے کمالات کے باوجود اس دور کے مسلمان شرفاء اور امراء کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا نمونہ تھے جس کی خوبیاں اور خرابیاں دونوں ان میں جمع تھیں، اس تمہید کے بعد ناظرین پروفیسر مسعود حسن کا مضمون ملاحظہ فرمائیں"۔ "م"

معارف کی گذشتہ دو اشاعتوں[1] میں "غالب کا مذہبی رجحان ان کے کلام کی روشنی میں" کے عنوان سے جو مقالہ شائع ہوا ہے اسے پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، گذشتہ چھ سات سال کی مدت میں غالب کے عقیدتمندوں نے کچھ اپنے جوش عقیدت میں اور کچھ کوئی چونکا دینے والی چیز کی تلاش میں "مضامین نو" کے اس قدر انبار لگا دئیے ہیں کہ ان کی بے سر و پا باتوں کا جواب دینا تو درکنار، ان کی طرف توجہ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے، میں اس مضمون کو پڑھ کر بھی خاموش رہ جاتا۔ مگر مضمون نگار کا تعلق مسلم

---

[1] معارف مارچ اور اپریل ۷۳ء۔

یونیورسٹی علی گڈھ جیسی مقتدر علمی و تعلیمی درسگاہ ہے، اور مضمون معارف جیسے موقر علمی اور مذہبی رسالے میں شائع ہوا ہے، اس لئے قلم اٹھانے پر مجبور ہوا، اسلئے بھی کہ مدیر معارف" کے اس نوٹ کے ایک حصہ سے جو مضمون کے آغاز میں درج ہے بعض غلط فہمیوں کا احتمال رہ جاتا ہے، یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں، پہلے نوٹ کا وہ حصہ پیش خدمت ہے:-[1]

"یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی نظر کا ثبوت ہے، اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈھ نکالے اور ان سے متعلق آیات پیش کر دیں، ابتک کسی نے اس نقطۂ نظر سے کلام غالب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، اس میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو غالب کو مذہب سے بالکل بیگانہ اور محض ایک آزاد مشرب رند لاابالی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں"[2]

میں خود غالب کا عقیدتمند اور انکی عظمت کا قائل ہوں، انھیں اردو کا عظیم شاعر سمجھتا ہوں، وہ فارسی شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، انھوں نے اردو نثرنگاری کو ایک طرزِ خاص عطا کیا، وہ فارسی زبان کے مسلّم الثبوت محقق اور دانشمند ہیں، لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں غالب کو مرشد کامل، شیخ طریقت اور عارف قرآن بھی تسلیم کر لوں، قرآن پاک کے رموز اور نکات کو سمجھنا تو دور کی بات ہے، ان کی عربی زبان سے واقفیت بس واجبی تھی، معمولی عربی صرف و نحو پڑھ لینے کے بعد قرآن پاک کے حقائق اور مطالب کو سمجھ لینا ناممکن ہے، رہ گیا تلمیحات قرآنی

---

[1] معارف مارچ و اپریل ۷۳ء ص ۲۰۱، [2] "معارف" اس نوٹ کا اوپر کا حصہ اسکا جواب ہے جسکو اس مضمون میں بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کی مزید وضاحت بھی ہے،

کا علم اور ان کا استعمال تو اردو اور فارسی کا کون شاعر ہے جس کے یہاں یہ چیزیں نہیں ملتی ہیں[1] حتی کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ہوگا جو حُسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا، خضر راہ، صبر ایوب، گلزار خلیل، دیدۂ یعقوب، عمر نوح، عصائے موسیٰ، جلوۂ طور، ماہ کنعاں اور وادی ایمن کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت نہ رکھتا ہو، اسی طرح جو لوگ اردو اور فارسی شعر و ادب کا تھوڑا سا بھی ذوق رکھتے ہیں وہ قرآن کی آیتوں کے ان ٹکڑوں الم نشرح، انا ربکم الاعلیٰ، الست بربکم، قالوا بلیٰ، کلوا واشربوا، لن ترانی ارنی، لیس کمثلہ شیٔ، اور لاریب فیہ کے مفہوم اور شان نزول سے آشنا ہوتے ہیں، اس کے لئے نہ کسی مذہبی رجحان کی ضرورت ہے، نہ عربی زباندانی کی صلاحیت کی، اور نہ قرآن کو سمجھنے اور اس کے لئے سخت محنت کی،

مضمون نگار نے اپنے طویل مقالے میں جو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

(۱) غالب کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام میں خدا، محمد، جنت، دوزخ، حور، رضوان، یوسف، آدم، ابراہیم، ادریس، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ، ایوب، یعقوب، اوامر و نواہی اور آیاتِ قرآنی کے اقتباسات عجمی حوالوں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، ساتھ ہی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں محض یہی نہیں کہ یہ حوالے دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں، بلکہ غالب کی تلمیحات قرآنی دوسرے شاعروں کی بہ نسبت متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں۔[2]

---

[1] مدیر "معارف" نے بھی اپنے نوٹ میں اسطرف اشارہ کیا ہے، [2] معارف ص ۲۰۷، (مارچ و اپریل ۷۳ء)

(۲) جہاں تک شاعری میں قرآنی تلمیحات کا تعلق ہے فارسی کے بڑے بڑے شعراء غالب کی کمیت اور کیفیت کو نہیں پہنچے، فارسی کے شاعروں نے اس ضمن میں بہت خطرناک حد تک غلطیاں کی ہیں، [1]

(۳) ان (غالب) کو قرآن سے خاص شغف تھا، اور وہی ان کے شاعرانہ فکر وتخیل کا محور تھا، [2]

پہلی بحث | مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ آیات قرآنی کے حوالے اور قرآن کے اقتباسات غالب کے یہاں دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں، تحقیق طلب ہے، اس سلسلے میں انھوں نے چند شاعروں سے غالب کا موازنہ کیا ہے، مگر اردو کے کسی شاعر کو سرے سے درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے، فارسی شعراء میں انھوں نے فردوسی، مولانا رومیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ، شیخ سعدیؒ، مولانا جامیؒ اور جمالی دہلوی کے اشعار سے بحث کی ہے، تعجب ہے کہ فارسی کے "بڑے بڑے شعراء" کی فہرست میں انھیں سب سے پہلے جمالی دہلوی یاد آئے، اور خاقانی، سنائی، عطار، عراقیؒ اور اقبالؒ کا نام لینا بھی انھیں گوارا نہیں ہوا،

مضمون نگار نے غالب کے مندرجہ ذیل اشعار[3] نقل کئے ہیں جنکی تلمیحات ان کی رائے میں متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان میں ندرت بیان کے سوا کوئی ایسی بات ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہو، قارئین "معارف" خود ملاحظہ فرمائیں :-

---

[1] معارف ص ۳۰۹ ، [2] ایضاً ص ۳۰۲ ،

[3] افسوس ہو کہ اس قبیل کے بعض فارسی اشعار کتابت کی غلطیوں کی وجہ سو نیز حوالے نہ ہونے کی بناء پر نہیں پڑھے جا سکے اور وہ یہاں نقل نہیں کئے جا سکے ہیں، بعض اشعار پر آیندہ صفحات میں بحث کی جائے گی،

ہر شبیہے را تماشائے درخور است   بوئے پیراہن بکنعاں می رود

تشگفت کہ یوسف بمیاں دانستہ باشد   دلو من ازیں چاہ گرانبار برآید

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر   لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

تجلّی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور   تبکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور

رفت آنکہ ما ز حسن مدارا طلب کنیم   سر رشتہ در کف ارنی گوئے طور بود

لن ترانی بجواب ارنی چون وچرا   من نہ انیم بشناس، و تو نہ آنی بشنو

نکتہ اے داریم و باباران نمیگوئیم فاش   طالب دیدار باید تاب دیدار آورد

کیا فرض ہے کہ سبکو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بدور تو شد لن ترانی کہن   فصاحت مکرر نسنجد سخن

ترا خواستگار است یزدان پاک   ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

ہیں عیسیٰ وساماں نوائش نفس گرم   ہاں موسیٰ وبرہان کمالش ید بیضا

نسیمش چوں دم عیسیٰ رواں بخش   صباحش چوں کف موسیٰ منور

فیض حق است قبول سخن وشادی فتح   بقلم نازم اگر تکیۂ موسیٰ بعصا ست

نظم را موجۂ حیوان فہمند   نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند

لبِ تو زندہ کن معجزۂ مسیحائی   رخِ تو جلوہ دہ شوکتِ سلیمانی

براہیم خوے، سلیمان فرے   مسیحا دمے مصطفیٰ گوہرے

لو ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں   اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک   اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ابن مریم ہوا کرے کوئی   مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

دلِ مایوس را تسکیں بمردن میتواں دادن	چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را
شنیدہ ای کہ بآتش نسوخت ابراہیم	ببیں کہ بے شرر و شعلہ میتوانم سوخت
بامن میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر	ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد
فرزند زیر تیغ پدر می نہد گلو	گر خود پدر در آتش نمرود می رود
زخونیکہ در کربلا شد سبیل	ادا کرد دوام زمان خلیل

دوسری بحث | دوسری بحث کا تعلق فارسی کے بڑے بڑے شعراء کی بہت خطرناک غلطیوں سے ہے، یہ مضمون کا سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصہ ہے جسے پڑھ کر سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے۔

مولانا عبد الرحمن جامی کی یوسف زلیخا پر یہ اعتراض ہے کہ "یہ مثنوی زلیخا کے خواب سے شروع ہوتی ہے اور قرآن مجید میں خواب کا کوئی ذکر نہیں ہے، (ان کا دار و مدار مسیحی کتابوں پر ہے)"[۵۰] مضمون نگار کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تلمیحات قرآنی کے استعمال کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسے قرآن کے بیان کردہ مضامین تک محدود رکھا جائے، انھیں خواب زلیخا پر اعتراض ہے مگر خود زلیخا کے نام کا ذکر قرآن میں کب موجود ہے، وہاں اسے امرأۃ العزیز کے نام سے پکارا گیا ہے، بلکہ جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے انجیل میں بھی یہ نام مذکور نہیں ہے، اسے وہاں Potiphar's wife کہا گیا ہے، اور کیا غالب کا یہ شعر مضمون نگار کی نظر سے نہیں گذرا ہے؟

ابھی آتی ہے بو، بالش سے اسکی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو، خواب زلیخا عار بستر ہے

---

[۵۰] معارف ص ۲۱۱، (مارچ و اپریل ۶۳ء)

مولانائے روم پر مضمون نگار کو اس کے سوا کوئی اعتراض نہیں مل سکا کہ ان کی زندگی میں لوگوں نے یہ کہہ کر ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے اشعار میں آیات قرآنی کی طرف اشارہ کرنے میں متن قرآنی کی پوری پوری اتباع نہیں کرتے ہیں،[۵۱] مولانا بالاتفاق عربی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، مثنوی میں ان کے سینکڑوں عربی اشعار اس کی شہادت کے لئے موجود ہیں، معارف قرآنی اور رموز قرآنی پر ان کی جو گہری نگاہ تھی اس سے کون واقف نہیں ہے، اس لئے عوام کے اعتراض کا جو مقصد اور مفہوم ہے وہ ظاہر ہے، اس کی تشریح آگے آئے گی۔

شیخ سعدی کے مندرجۂ ذیل دو شعر پر جو اعتراض ہے وہ بھی سن لیجئے،

پسر نوح با بداں بنشست	خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحاب کہف روزے چند	پئے نیکاں گرفت مردم شد

مضمون نگار کے خیال میں "با بداں بنشست" اور "مردم شد" دونوں فقرے کے مفہوم متن قرآنی سے خارج ہیں،[۵۲] کوئی مضمون نگار کو بتائے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کا "عمل غیر صالح" یہی تو تھا کہ وہ باپ پر ایمان نہیں لایا اور ایمان نہ لانے والوں کے ساتھ ہو گیا، "مردم شد" کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کتا اچھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر وفادار بن گیا، اور وفاداری شرطِ آدمیت ہے۔

شیخ پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے اپنی "شہرۂ آفاق تصنیف گلستاں میں تلمیحات قرآنی کا شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے"،[۵۳] حالانکہ گلستاں کے صفحات ان تلمیحات سے بھرے ہوئے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:-

---

[۵۱] معارف مارچ اپریل ۶۳ء ص ۲۱۱، [۵۲] ایضاً [۵۳] ایضاً۔

(۱) قرصِ خورشید در سیاہی شد ؏ یونس اندر دہانِ ماہی شد

(۲) زکاربستہ میندیش و دل شکستہ مدار ؏ کہ آبِ چشمۂ حیوان درونِ تاریکیست

(۳) تو گوئی تا قیامت زشت روئی ؏ بر و ختم است و بر یوسف نکوئی

(۴) دخترِ حیلی ہمچناں در روئے تمکن تا بجائے رسید کہ نانے از دست بجانے ندادے وگربہ ابوہریرہؓ را بہ لقمۂ ننواختے وسگ اصحاب را استخوانے نینداختے۔

(۵) شنیدم کہ بدریائے مغرب اندر راہ مصر پیش گرفتہ بود و خیال فرعونے در سر حتی اذا ادرکہ الغرق بادے مخالف بکشتی بر آمد۔

(۶) کاج کا نانکہ عیب می گفتند ؏ روئیت اے دلستاں بدیدندے
تا بجائے ترنج در نظرت ؏ بے خبر دستہا بریدندے

تا حقیقت معنی بر صورت دعوی گواہی دادے کہ ذٰلکن الذی لمتننی فیہ۔

(۷) چوں آزر بت تراش کہ بحجت با پسر بر نیامد بجنگ برخاست آیۃ لئن لم تنتہ لارجمنک ....

(۸) دین بدنیا فروشاں خرند یوسف را فروشند تا چہ خرند۔

(۹) یوسف صدیق علیہ السّلام در خشک سال سیر نخوردے تا گرسنگاں را فراموش نکند۔

(۱۰) برادران یوسف علیہ السلام بدروغے کہ موسوم شدند براستِ گفتن ایشاں اعتماد نماند قال بل سولت انفسکم امرا۔

(۱۱) چوں کنعاں را طبیعت بے ہنر بود ؏ پیمبر زادگی قدرش نیفزود
ہنر بنمائے اگر داری نہ گوہر ؏ گل از خار ست ابراہیم از آزر

یہ صرف تلمیحاتِ قرآنی کی مثالیں ہیں۔ گلستاں میں قرآن کے اقتباسات اور قرآنی آیات کی تضمینیں اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا ناممکن ہے۔ شیخ سعدی کے متعلق کے معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے بغداد کے مدرسۂ نظامیہ میں اسلامیات کی تعلیم پائی تھی۔ وہ علامہ ابن جوزیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خاص شاگردوں میں تھے۔ عربی زبان پر انھیں یہ قدرت تھی کہ وہ بے تکلف اس میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات میں عربی کے سینکڑوں اشعار محفوظ ہیں۔ خاص گلستاں سے تلمیحاتِ قرآنی کے نمونے اوپر پیش کئے گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے قرآنی تلمیحات کے استعمال میں "خطرناک حد تک غلطیاں کی ہیں" یا گلستاں میں تلمیحات قرآنی کی طرف "شاذ و نادر اشارے ہیں" تو اس کا خاموشی کے سوا کیا جواب دیا جاسکتا ہے، شاید شیخ نے کسی ایسے ہی موقع پر اپنے کسی معترض کو کہا تھا،

کہ برہاں قوی باید و معنوی ؏ نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

سعدی کے دو اور شعروں پر بھی مضمون نگار چیں بجبیں ہیں۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند ؏ کہ اے روشن گہر پیر خردمند
ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی ؏ چرا در چاہ کنعانش ندیدی

اعتراض یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا مصر سے یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھنا "کسی قدر اصلیت کے خلاف ہے"۔ بات واضح نہیں ہوتی ہے، اگر مضمون نگار کا یہ خیال ہے کہ یہ قرآن کے بیان کے خلاف ہے جیسا کہ انھوں نے قرآن کی ایک آیت نقل کرکے اور اس کا ترجمہ پیش کرکے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو مضمون نگار

پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ قرآن کی وہ آیت درج ذیل ہے:۔

ولما فصلتِ العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف

اس کا ترجمہ انھوں نے یہاں یہ کیا ہے، (یعنی جب اونٹوں کا قافلہ مصر سے روانہ ہوگیا)[1]
مگر اسی مضمون میں دوسری جگہ خود ان کا ترجمہ یوں ہے:۔

جب قافلہ چلا ہی تھا کہ ان کے باپ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا......[2]

اگر مضمون نگار نے خود اپنے دوسرے ترجمے ہی پر ایک نظر ڈال لی ہوتی تو سعدی کے شعر پر اعتراض کرنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑتی۔ مصر سے روانہ ہوتے ہی جو خوشبو حضرت یعقوبؑ کو ملی وہ مصر ہی سے تو گئی ہوگی، کیا اس آخری اعتراض پر شیخ سعدیؒ کی روح بے اختیار یہ نہیں پکار اٹھی ہوگی:۔

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی بری رونقِ مسلمانی

خواجہ حافظ بڑے پایہ کے عالم ہیں، ان کے علم و فضل کا سبھوں نے اعتراف کیا ہے، چنانچہ آقای دکتر رضازادہ شفق ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔[3]

حافظ تحصیل علوم و کمالات را در زادگاہ خود کرد و مجالس درس علماء و فضلای بزرگ زمان خود درا کہ یکے آنہا قوام الدین عبداللہ باشد درک نمودہ در علوم بمقامے رفیع رسید و بشہادت محمد گلندام شاعر بزرگ مایہ "تحشیہ کشاف و مصباح و مطالعہ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تحسین دواوین عرب" پرداختہ کہ ظاہراً مقصود کشاف زمخشری در تفسیر و مفتاح مطرزی در نحو و طوالع الانوار من مطالع الانظار تالیف بیضاوی در حکمت و یا شرح مطالع قطب الدین رازی در منطق و مفتاح العلوم سکاکی

---

[1] معارف ص ۲۱۲۔ [2] معارف یہ ترجمہ نہیں ہو بلکہ لما فصلت العیر کی وضاحت ہو اسی لئے آیت کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ نیچے لکھا گیا ہو۔ [3] معارف ص ۲۰۸، [4] تاریخ ادبیات ایران ص ۳۳۶۔

در ادب بودہ است۔

ان کے متعلق مضمون نگار کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:۔

اشعار کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کا دیوان زیادہ تلمیحاتِ قرآنی کا حامل نہیں اور جو تلمیحات شامل بھی ہیں ان کا طریقہ دیانتداری کے خلاف ہے، اور حافظ علیہ الرحمہ کے شایان شان نہیں،[1]

مضمون نگار کو ان کے مندرجہ ذیل تین اشعار پر سخت اعتراض ہے:۔

(۱) در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند آدم بہشت روضۂ دار السلام را

ان کی رائے میں "دونوں مصرعے اصلیت سے خارج ہیں، کہتے ہیں" چوں آبخور نماند" حالانکہ قرآن میں صاف ہے: وکلا منھا رغدا حیث شئتما۔ "آدم بہشت" یعنی آدم نے چھوڑ دیا، حالانکہ قرآن کہتا ہے: واخرج ھما کا نافیہ۔ یوں تو چھوڑ دینے اور نکالے جانے کا عملی نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے، مگر جبر و قدر میں اس مسئلے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ "دار السلام بھی شاید وہ قافیے کی ضرورت سے لائے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے۔ قرآن میں صرف جنت کا لفظ ہے، یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ اور دار السلام اس کا ایک طبقہ ہے۔[2] اس کے جواب میں عرض ہے کہ "آبخور نماند" صاف ظاہر ہے یہ آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کے بعد کا نقشہ ہے، اور قرآن کی آیت اس سے پہلے کا نقشہ پیش کرتی ہے، لہٰذا ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ شاعر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب آدم کو جنت کی نعمت حاصل نہیں ہے تو وہ نعمت اس کے لئے نعمت نہیں ہے،

---

[1] معارف ص ۲۱۳، [2] ایضاً،

اس لئے "آدم بہشت" یعنی آدم نے اسے "خود چھوڑ دیا" کہنا پڑا، اگر یہ کہا جاتا کہ آدمؑ نکالے گئے تو بات نہیں بنتی، یہ صحیح ہے کہ قرآن میں جنت کے لئے دار السلام نہیں استعمال کیا گیا ہے، مگر اسے دار السلام کہنے میں کیا حرج ہے؟ یہ سلامتی اور عافیت کی جگہ تو ہے ہی، چنانچہ قرآن میں یہ موجود ہے کہ جنتیوں کو سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین (۷۳۔ زمر) کہہ کر خوش آمدید کہا جائیگا، قرآن میں بہشت کے لئے صرف جنت کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ بھی محلِ نظر ہے، ان باتوں کے علاوہ خود غالبؔ نے جنت کے لئے دار السلام استعمال کیا ہے:۔

باد دست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام　　داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست [۱]

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

اس شعر پر اعتراض سنئے: قرآن کو سرتا سر دیکھ جایئے، اس میں کہیں لفظ عشق موجود نہیں ہے، اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ انتہائی محبت کا نام ہے تو زلیخا کا جو کیرکٹر قرآن نے پیش کیا ہے اس سے زلیخا کی محبت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا،[۲] پہلی بات تو یہ ہے کہ "عشق" عربی لفظ ہونے کے باوجود نہ صرف قرآن میں نہیں آیا ہے، بلکہ عربی ادب میں بہت کم مستعمل ہوا ہے، راقم الحروف عربی ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہے، اسے یاد نہیں آتا ہے کہ کسی جاہلی شاعر نے اسے یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے، عباسی عہد میں جب عربی زبان عجمی تہذیب سے متاثر ہوئی تو یہ لفظ خاص خاص شعرا کے یہاں استعمال ہونے لگا،[۳] چنانچہ متنبی کہتا ہے:۔

۱؎ یادگار غالب، شانتی پریس الہ آباد ص ۲۱۲، ۲؎ معارف ص ۲۱۴، ۳؎ میری رائے مزید تحقیق کی محتاج ہے لیکن موجودہ بحث پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اسلئے اس تحقیق کو کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھنا مناسب ہوگا۔

(۱) زیدی اذی مھجتی اذدک ھوتی　　فاجعل الناس عاشق "حاقد

(۲) یفرق مابین الکماۃ وبینھا　　بضرب یبلی حر کل عاشق

(۳) ومن لم یعشق الدنیا قدیما　　ولکن لاسبیل الی الوصال

عربی زبان میں عشق یا انتہائی محبت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے حُب، صبابۃ وُد، شوق اور غرام جیسے الفاظ آتے ہیں، دوسرے حافظ نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ لفظ عشق قرآن میں موجود ہے، رہ گیا مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ قرآن میں زلیخا کی محبت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا ہے، سراسر غلط ہے، مضمون نگار نے سورہ یوسف کی بہت سی آیتیں نقل کی ہیں، اسی سورۂ یوسف میں یہ آیت موجود ہے:

وقال نسوۃ فی المدینۃ امرأۃ العزیز تراود فتٰھا عن نفسہ قد شغفھا حبا انا لنرٰھا فی ضلال مبین۔

(۴) یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور　　کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ "یوسف گم گشتہ کی واپسی قرآن میں کہیں بھی مذکور نہیں، اور جب وہ واپس نہیں آئے تو ظاہر ہے کہ کلبۂ احزاں" کیسے "گلستاں" ہو سکتا تھا، برعکس اس کے حضرت یوسفؑ کے اعزہ خود مصر گئے تھے،"[۱] مضمون نگار کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ "باز آید بکنعاں" سے صرف بچھڑے ہوئے باپ بیٹے کی دوبارہ ملاقات کا مفہوم ادا کرنا مقصود ہے، اس کے علاوہ یوں بھی مضارع کے صیغے "باز آید" اور "شود" استعمال کر کے صرف ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے، یہ کسی گذرے ہوئے واقعہ کا بیان نہیں ہے اس لئے بیجا ہے حافظ نے کیا گناہ کیا ہے؟

۱؎ معارف ص ۲۱۴،

تیسری بحث غالب کے متعلق فاضل مضمون نگار کا تیسرا نظریہ کہ

"ان کو قرآن سے خاص شغف تھا، اور وہی ان کے شاعرانہ فکر وتخیل کا محور تھا"

حاصل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے، مضمون نگار کو غالب کی دنیاداری، ان کے عیش امروز، انکی شراب خوری، قماربازی اور بازاری عورتوں پر ان کی گرویدگی کا اعتراف ہے[1]، غالب کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی، اس کا بھی اقرار ہے[2]، یہ بھی تسلیم ہے کہ غالب نے مطالب قرآنی میں کچھ تحریف بھی کی ہے[3]، اور بعض مقامات پر متن قرآنی سے واقفیت کے باوجود انھوں نے معنی پر غور نہیں کیا اور عربی اور فارسی میں فرق نہیں کر سکے[4]، مضمون نگار نے ان کے کلام سے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں، لیکن اس پر بھی انھیں قرآن پاک کو غالب کے فکر وتخیل کا سرچشمہ قرار دینے پر اصرار ہے،

غالب کی زندگی کے اہم اور غیراہم واقعات پوری تفصیل اور صحت کیساتھ محفوظ ہیں، ایسے ذمہ دار لوگوں کی تحریریں اور بیانات موجود ہیں جنھوں نے ان کو خلوت اور جلوت میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، غالب کے خود نوشت حالات کے دفتر کے دفتر ہمارے سامنے ہیں، ان کے مذہبی رجحانات اور مذہبی عقائد کے متعلق خود ان کے اپنے بیانات کثیر تعداد میں موجود ہیں، اور ایسے بیانات موجود ہیں جنکو روایتی مشرقی انکسار پر محمول کرکے یا شاعرانہ سخن گستری کی چھاپ لگا کر، یا صوفیہ کی شطحیات اور طامات کی آڑ لے کر رد نہیں کیا جا سکتا ہے، دوسری طرف خشیت الٰہی سے یا طلب مغفرت کیلئے اقرار گناہ اور چیز ہے، اور عملاً فسق وفجور میں مبتلا رہنا

[1] معارف ص ۲۴۴ و ۲۴۵، [2] ایضاً ص ۲۰۷، [3] ایضاً ص ۳۰۰، [4] ایضاً ص ۳۰۱،

اور اس پر اصرار کرنا، یا مذہبی احکام سے تمسخر کرنا اور چیز، غالب کے متعلق پوری صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہے کہ اچھی خاصی عمر ہو جانے تک انھوں نے عربی میں نحو میر سے زیادہ نہیں پڑھی تھی، ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ غالب نے مطالب قرآنی کے سمجھنے کے لئے جو کمال حاصل کیا تھا اور اس کے لئے جو محنت وکاوش کی تھی اس کا سراغ لگانا مشکل ہے کیونکہ ان کی وفات کو سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں اور معاصرین میں کوئی موجود نہیں ہے[1]، نہ صرف حقائق سے انکار کرنا ہے بلکہ دوسروں کو شدید گمراہی میں ڈال دینا ہے،

غالب کے اعمال، اور عربی میں ان کے مبلغ علم کا حال آپ سن چکے، اب ان کے اقوال بھی آپ کے سامنے ہیں، یوں تو وہ قرآن اور مذہب کا جب بھی نام لیتے ہیں تو زیادہ تر انکا مقصد استہزا اور استخفاف ہوتا ہے، چنانچہ گذشتہ صفحات میں ان کے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں وہ تقریباً سب کے سب یہاں نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں، مگر کچھ نئے اشعار سنئے:-

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں — شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

وہ چیز جسکے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے؟

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

[1] معارف مارچ واپریل ۱۹۶۲ء ص ۲۰۷،

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد خلد لب لعل تو ہم اینت و ہم آنست مرا

بادۂ مشکبوئی ما بید و کنار کشت ما کوثر و سلسبیل ما طوبیٰ ما بہشت ما

گفتم حدیث دوست بقرآں برابر است نازم بکفر خود کہ بایماں برابر است

چوں نیست تاب برق تجلی کلیم را کے در سخن بہ غالب آتش بیاں رسد

اگر کلیم شود ہمزبان سخن نکنیم وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

خود را ز سرد مہری اسلامیان شہر در حلقۂ پرستش آذر گرفتہ ایم

اپنی مشہور نظم "چراغ دیر" میں بنارس کو "کعبۂ ہندوستان" اور "بہشت خرم و فردوس معمور" کہکر بھی سیر نہیں ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

شبے پرسیدم از روشن بیانے ز گردشہائے گردوں راز دانے

کہ بینی نیکویہا از جہاں رفت وفا و مہر و آزرم از میاں رفت

بدیں بے پردگیہائی علامت چرا پیدا نمی گردد قیامت

سوئے کاشی باندازِ اشارت تبسم کرد و گفتا ایں عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

اللہ اللہ! ایک مسلمان کے دل میں کاشی کی یہ عظمت ہے، مگر اس کے نزدیک قرآن مجید کی قیمت شراب کے ایک پیالے کے برابر بھی نہیں ہے، وہ نعوذ باللہ مے صرف کے بدلے قرآن اور خرقہ دونوں بیچ دینے کے لئے تیار ہے،

غالب اگر خرقہ و مصحف بہم فروخت پرسد چرا کہ نرخ مئے لعل فام چیست؟

(باقی)

خریطۂ جواہر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۷)

آقا ملک معروف۔ ہرزہ گرد باغ چوں بلبل نیم پروانہ ام می توانم کرد پروازے کہ بس باشد مرا

میں بلبل کی طرح باغ کا آوارہ گرد نہیں ہوں (جس کا کوئی نتیجہ نہیں) بلکہ پروانہ ہوں کہ ایک ہی پرواز میرے لیے کافی ہے. یعنی ایک ہی پرواز میں جل کر جان دیدیتا ہوں،

امروز صبا گرد رہِ یار ندارد گویا کہ بر آں راہگذر چشم ترے ہست

آج بادِ صبا میں محبوب کی راہ کی گرد نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس گلی میں کوئی اشکبار آنکھ ہے جس کے آنسوؤں سے گرد بیٹھ گئی ہے،

مدتے شد کہ دل از غیر تو پرداختہ ام گر قدم رنجہ کنی گوشۂ تنہائی است

ایک مدت سے میں نے دل کو غیر کے خیال سے بالکل خالی کر دیا ہے، اگر آپ قدم رنجہ فرمائیں تو بالکل تنہائی ہے،

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا شعر ہے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی،

ملک قمی۔ چنانکہ سایہ شود خود میانِ شمع ز جا بردم چوں بآئینہ رو برگردد

جس طرح دو شمعوں کے درمیان سایہ کافور ہو جاتا ہے، اسی طرح جب محبوب آئینہ کے روبرو ہوتا ہے تو (گویا دو شمعیں آمنے سامنے ہوتی ہیں، ایک محبوب دوسرا اس کا عکس) اس منظر کو دیکھ کر میرے ہوش و حواس باقی نہیں رہتے اور اپنے سے بیخبر ہو جاتا ہوں،

در سینہ دلم گم شد تہمت بہ کہ بندم — غیر تو دریں خانہ کسے راہ ندارد

میرے سینہ میں دل گم ہو گیا ہے مگر (چوری کی) تہمت کس پر لگاؤں، اس گھر میں تیرے سوا کسی کا گذر نہیں ہے، اس شعر کی خوبی چوری کی حسن تعبیر ہے، ظاہر ہے کہ دل کا چور محبوب ہے لیکن تصریح کے ساتھ اس کو نہیں کہتا،

بدگمانی ملاحظہ ہو:

گوید مرو ز خانہ کہ من خواہم آمدن — تا من بریں بہانہ نیایم بکوئے تو

محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ گھر سے کہیں نہ جانا میں آؤں گا تاکہ میں اس کے انتظار میں اسکی گلی میں نہ جاؤں،

من کیستم کز ستم ہمچو توئی داد کنم — کہ کند حرف مرا گوش کہ فریاد کنم

میری کیا ہستی ہے کہ تیرے جیسے شخص کے ظلم کی داد خواہی کروں، اگر میں فریاد بھی کروں تو کون سنے گا، یعنی تیرے مقابلہ میں کوئی میری فریاد بھی سننے والا نہیں ہے.

محمد افضل منصف۔ بیخود از زمزمۂ مرغ گرفتار شدم — دگرے یاد تو میکرد من از کار شدم

میں مرغ گرفتار کا زمزمہ سنکر بیخود ہو گیا، یاد تو تجھکو دوسرا شخص کر رہا تھا، اور میں آپے میں نہیں رہا،

ع — ساغر کو میرے ہاتھ سے لیجیو کہ چلا میں

مشہدی قمی۔ برویم از قفس در فیضے تواں کشود — من ہم ز آشیاں بامید سے پریدہ ام

میرے لیے بھی قفس کا دریفیض کھلنا چاہیئے کیونکہ میں بھی کسی امید ہی میں آشیانہ سے اڑا ہوں اس لیے اس فیض کا مستحق ہوں،

منعم حکاک۔ در خمارم روز و شب باآنکہ صہبا می کشم — خشک لب چوں ساحلم ہر چند دریا می کشم

باوجودیکہ شراب پیتا ہوں لیکن رات دن خمار ہی میں رہتا ہوں (مستی نہیں پیدا ہوتی) میری مثال ساحل کی ہے کہ ہر چند سمندر کی موجیں اسے سیراب کرتی رہتی ہیں، لیکن اس کے لب خشک ہی رہتے ہیں،

آنرا کہ زور بازوئے کسبِ ہنر بود — دستِ پُر آبلہ صدفِ پر گہر بود

جس کے بازوؤں میں کمانے اور ہنر کی طاقت ہوتی ہے، اس کے آبلہ بھرے ہوئے ہاتھ گویا موتی سے معمور صدف ہوتے ہیں، یعنی دولت و ثروت اور عروج، ترقی، محنت اور ہنر ہی سے حاصل ہوتی ہے،

مخلص کاشی۔ زمانہ حالتِ بیماریِ اجل دارد — کدام روز کہ بدتر ز روز اول نیست

زمانہ کی حالت موت کی بیماری جیسی ہے جس میں روز بروز مریض کی حالت بدتر ہی ہوتی جاتی ہے، اسی طرح زمانہ کی حالت سدھرنے کے بجائے برابر خراب ہی ہوتی جاتی ہے،

بیگانہ وار می گذرد از سواد چشم — اے نور دیدہ حبِ وطن در دل تو نیست

محبوب کی جگہ سواد چشم ہے اور سواد آبادی کے آس پاس کے حصہ کو بھی کہتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہے کہ تو سواد چشم سے بیگانہ وار گذر جاتا ہے، اے نور دیدہ تیرے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے کہ سواد چشم پر بھی نظر نہیں ڈالتا۔

در کشادِ گرہ خلق مکن کوتاہی — ہمچو ناخن اگر از دست تو برمی آید

اگر ناخن کی طرح تیرے ہاتھ سے گرہ کھل سکتی ہے تو مخلوق کی گرہ کھولنے میں کوتاہی

کر یعنی اگر تجھ سے کسی انسان کا کام نکل سکتا ہے تو اسے کرنا چاہیے ،

باں منت پے قتل من آں مغرور می آید — کہ پنداری طبیبے بر سر رنجور می آید

وہ بت مغرور اس طرح احسان رکھتے ہوئے میرے قتل کے لیے آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی طبیب کسی بیمار کے علاج کے لیے آتا ہے، یعنی قتل کو بھی احسان سمجھتا ہے،

شنیدم گفتہ گر جان ما مخلص چہ می خواہد — بقربانت شوم ایں حرف باید از تو پرسیدن

اس شعر کی خوبی اس کا طرز ادا ہے، کہتا ہے، میں نے سنا ہے کہ تو کہتا ہے کہ آخر مخلص مجھ سے کس چیز کا خواہشمند ہے "اے تیرے قربان اس بات کو تو تجھ سے پوچھنا چاہیے" کہ تو ہی اس کا جواب دے سکتا ہے،

میرک معنی ۔ آں مہ کہ از بے طاقتی من گلہ دارد — گو آئینہ برگیر و جواب گلہ بشنو

وہ ماہ رو جس کو میرے ضعف اور ناتوانی کی شکایت ہے کہ میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا، اس سے کہو کہ وہ آئینہ دیکھ لے، اس شکایت کا جواب مل جائے گا، یعنی اس ناتوانی کا سبب اس کا حسن ہے،

محمد مقیم طہرانی ۔ بے جام بادہ سیر گلستاں تمام نیست — دستے کہ بے پیالہ بود شاخ بے گل است

بغیر جام شراب کے گلستاں کی سیر کا پورا لطف حاصل نہیں ہوتا جس ہاتھ میں شراب کا پیالہ نہیں وہ بے پھول کی شاخ ہے،

تا گشتہ است گوشۂ میخانہ منزلم — آبے نمی خورد دگر از ہیچ جا دلم

جب سے میخانہ کا گوشہ میری منزل مقصود بنا ہے، کسی دوسری جگہ میرا دل پانی بھی نہیں پیتا، یعنی اسکی پیاس میخانہ کے سوا کہیں نہیں بجھتی،

معمار خود مشو کہ کنی خانہا خراب — ویرانہ باش گر تو بنائے شود بلند

تم اپنے معمار آپ نہ بنو ورنہ آباد گھروں کو ویران کر دو گے، بلکہ ویرانہ بنو تو تمھاری بنیاد پر عمارت تعمیر ہو، اس کا صوفیانہ مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی اصلاح آپ نہیں کر سکتا، اس سے اور خرابی پیدا ہوتی ہو بلکہ اپنے کو ناقص اور ہیچ سمجھ کر ہی بڑا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے،

محمد رضا مشتاقی ۔ گلشن اگرچہ صیقل آئینۂ دل است — اما بگرد دامن صحرا نمی رسد

گلشن اگرچہ آئینۂ دل کے لیے صیقل ہے، جس سے اس کی کدورت اور افسردگی دور ہوتی ہے، لیکن وہ دامن صحرا کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا، اسکی بات ہی اور ہے، یعنی دیوانگان محبت کے لیے گلشن کی سیر سے صحرا نوردی زیادہ خوش آیند ہے،

مبارک اللہ ہوش ۔ آنکہ با وصل ہم نمی سازد — دل بے صبر و بیقرار من است

جس کو وصل سے بھی سکون و اطمینان نہیں حاصل ہوتا وہ میرا بے صبر و بیقرار دل ہے۔

حکیم مرزا محمد ۔ بلبل بہ فغاں من بخموشی غم خود را — ہر کس بزبانیکہ توانست ادا کرد

بلبل نے فغاں کے ذریعہ اور میں نے خموشی کے ذریعہ اپنا غم دل بیان کیا جس سے جس زبان میں ہو سکا، اس کو ادا کیا، یعنی بلبل کی فغاں اور عاشق کی خموشی دونوں کا مقصد ایک ہے صرف زبان جدا ہے،

انند رام مخلص ۔ در جہاں از اصل کار ما کسی آگاہ نیست — ایں مرقع را اگر تصویر عنقائیم ما

دنیا میں ہمارے اصل مقصد سے کوئی بھی واقف نہیں اور اس مرقع میں ہماری حیثیت عنقا کی تصویر کی ہے جس کے وجود کا پتہ نہیں،

میفروشد بدو عالم نگہے — چشم بد دور ہنوز ارزان است

محبوب ایک نگاہ دو عالم میں بیچتا ہے، یعنی اس کی ایک نگاہ کی قیمت دونوں عالم

ہے، چشم بد دور اس قیمت میں بہت ارزاں ہے۔

بدست غیر چو داماں او نظارہ کنم   بغیر ازیں کہ گریباں درم چہ چارہ کنم

جب میں محبوب کا دامن رقیب کے ہاتھ میں دیکھتا ہوں تو اپنا گریباں پھاڑنے کے سوا اور کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے، اس شعر میں داماں اور گریبان سے لطف پیدا کیا گیا ہے،

ازاں ہر لحظہ در برمی کشم سرو گلستاں را   کہ ایں رعنا جواں بسیار می ماند بیار من

میں باغ کے سرو سے بار بار اس لیے لپٹتا ہوں کہ یہ جوان رعنا میرے محبوب سے بہت مشابہ ہے،

حضرت نظام الدین اولیا نرگسی۔ از تو نتواند بریدن کس بآسانی مرا

گرنمی دانم کسم آخر تو میدانی مرا

کوئی شخص مجھکو آسانی سے تجھ سے جدا نہیں کرسکتا، اگر میں خود اپنے کو نہیں جانتا لیکن تو تو مجھکو جانتا ہے،

تا کے اے دل فکر درد بے دوائے میکنی   از برائے خود چہ کردی کز برائے من کنی

دل سے کہتا ہے کہ تو میرے درد لا دوا کی فکر کب تک کرتا رہے گا تونے اپنے لیے کیا کیا ہے کہ میرے لیے کرے گا، یعنی اس بیماری کا اصل سبب تو تو ہی ہے، جب تو اپنا علاج نہ کرسکا تو میرا کیا کرے گا۔

بابا نصیر گیلانی۔ قدر وفائے من چو نداند گذاشتیم   چنداں جفا کند کہ خود از خود خجل شود

اگر محبوب میری وفا کی قدر و قیمت نہیں جانتا تو میں نے بھی اس کو اس کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اتنی جفائیں کرے کہ آخریں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہو،

دے دارم خراب از التفات چشم پرکارش   ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیارش

میرا دل اس کی پرکار اور فسوں ساز آنکھوں کی توجہ کا مارا ہوا ہے، اس لیے سب لوگ تو

اس کے ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں اور میں اس کے لطف و کرم سے ڈرتا ہوں کہ اس کا نتیجہ ظلم سے بھی زیادہ خراب نکلتا ہے،

نسبتی مشہدی۔ میرفت و عالمے نگرانش ز بیکسی

رشکم بدل فزود کہ تاب نظر نداشت

محبوب گذر رہا تھا اور ایک مخلوق اس کو بیکسی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اس سے میرا رشک اور بڑھ گیا کہ اس میں دیکھنے کی بھی تاب و تواں نہ تھی،

نطقی نیشاپوری۔ چہ لازم است کہ بدنام قتل من باشی   زمانہ و سپہرے و روزگارے ہست

یہ ضروری نہیں ہے کہ تو میرے قتل میں بدنام ہو، اس کیلئے زمانہ آسمان اور روزگار موجود ہیں، ان کے سر الزام رکھ دیا جائے گا،

پس از گل گر رود بلبل ز گلشن جائے اندازد   باں چشمیکہ گل دیداست نتواند خزاں دیدن

اگر موسم گل کے بعد بلبل گلشن سے چلی جائے (تو لائق عفو ہے) کیونکہ جن آنکھوں سے پھولوں کو دیکھا ہے، اس سے خزاں کا منظر نہیں دیکھ سکتی،

میر نظام دست غیب۔ نہاد برلب من دست بہر خاموشی   دگر بروئے خود آں دست از حیا نگذاشت

محبوب نے مجھکو خاموش کرنے کے لیے میرے لبوں پر جو ہاتھ رکھا تھا، اس کو شرم کی وجہ سے پھر اپنے منہ سے نہیں لگایا کہ اس سے بالواسطہ اس کے چہرہ کا لمس ہو جاتا،

نے ز بہر آمدن پرسی رہ ویرانہ ام   بہر آں پرسی کہ دیگر بار ازاں رہ نگذری

میرے ویرانہ کا راستہ تو نے آنے کے خیال سے نہیں پوچھا، بلکہ اس لیے پوچھا ہے کہ دوبارہ اس راہ سے نہ گذرے،

من نمی گویم نصیب مدعی ہجراں شود   آنچہ با ما در وصلش باشد نصیبش آں شود

میں یہ نہیں کہتا کہ رقیب ہجر میں مبتلا ہو بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اس کے دل میں میرے متعلق جو خیال ہو وہی اس کو پیش آئے، یہ شعر حسن تعبیر کی اچھی مثال ہے،

غبارے گر نشیند از رہ آں نازنیں برمن　　بود بادِ صبا را منتِ روئے زمیں از من

اگر اس نازنین کے کوچہ کی خاک مجھ پر پڑ جائے تو یہ بادِ صبا کا اتنا بڑا احسان ہوگا کہ گویا پورے زمین کا احسان مجھ پر ہوگیا،

گر درد کند پائے تو اے حور نژاد　　از درد مداں کہ ہرگزت درد مباد

ایں دردِ من است بر تنش رحم آمد　　از بہر شفاعتم بپائے تو فتاد

اے حور نژاد اگر تیرے پاؤں میں درد ہوتا ہے تو اس کو درد نہ سمجھ، خدا تجھے درد سے محفوظ رکھے، درحقیقت یہ میرا درد ہے، اس کو میری حالت پر رحم آیا ہے، اس لیے میری سفارش میں تیرے پاؤں پڑا ہے،

نظری نیشاپوری۔　جرمِ من است پیش تو گر قدرِ من کم است
خود کردہ ام پسند خریدارِ خویش را

اگر تیری نگاہ میں میری قدر و قیمت کم ہے تو اس میں تیرا قصور نہیں ہے، اسلیے کہ میں نے اپنا خریدار خود پسند کیا ہے اس لیے اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے،

شرم می آید ز قاصد طفل محجوب مرا　　بر سرِ راہش بیندا زید مکتوب مرا

میرے کمسن شرمیلے محجوب کو قاصد سے (خط لینے میں) شرم آتی ہے، اس لیے میرے خط کو اسے دینے کے بجائے اس کی رہگذر میں ڈال دو کہ وہ آنکھ بچا کر اٹھالے،

بے سبب گر دادی آزارم خجل از من مباش　　کردہ ام خاطر نشانِ خویش صد تقصیر را

اگر تونے بے سبب مجھکو تکلیف پہنچائی ہے تو تجھکو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے خود اپنے دل میں اپنے کو سیکڑوں خطاؤں کا مجرم بنالیا ہے،

دعا کنید بوقت شہادتم او را　　کہ ایں دمیست کہ درہائے آسماں باز است

میری شہادت کے وقت قاتل (محبوب) کو دعا دو کیونکہ اس وقت (قبولیت دعا کیلیے) آسمان کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس لیے دعا ضرور قبول ہوگی،

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

محبوب کا پورا سراپا اتنا حسین ہے کہ اس کے جس حصہ کو دیکھتا ہوں اس کا کرشمہ دل کا دامن کھینچتا ہے کہ اصل دل لگانے کی جگہ یہی ہے،

نیست لذت ز نظر بازی بزمیکہ درو　　خندہ زیر لب دگریۂ پنہانی نیست

اس بزم کی نظر بازی میں کوئی لذت نہیں ہے، جس میں خندہ زیرلب کے ساتھ باطن کی آنکھوں میں گریہ نہ ہو کہ اصل لذت و حلاوت اسی سے حاصل ہوتی ہے،

خونِ ترا چہ قدر نظیری خموش باش　　ایں بس کہ دعویٰ از طرفِ قاتلِ تو نیست

نظیری (اپنے قتل پر) خاموش رہو، تمھارے خون کی قیمت ہی کیا ہے کہ اس کا گلہ کیا جائے، یہی غنیمت سمجھو کہ قاتل کی طرف سے کوئی دعویٰ تم پر نہیں ہے،

پایم بہ پیش از سرایں کو نمی رود　　یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

اس گلی سے میرے قدم آگے نہیں بڑھتے، دوستو بتاؤ کہ یہ کس کی جلوہ گاہ ہے، جس کی کشش آگے نہیں بڑھنے دیتی،

رسوا منم وگرنہ تو صد بار در دلم　　رفتی و آمدی وکسے را خبر نشد

میں خود اپنی رسوائی کا سبب ہوں، ورنہ تو سیکڑوں بار میرے دل میں آتا جاتا رہا، اور کسی کو خبر نہ ہونے پائی،

قاصد جگرم سوخت چہ پیغام وچہ نامہ — دل بود بہاں خوش کہ بامید خبر بود

یار سے نامہ وپیام کا کیا ذکر قاصد نے تو (سوال بتاکر) دل ہی جلا دیا، اس کے نہ آنے تک دل خوشخبری کی امید میں خوش تھا، قاصد نے بالکل مایوس کر دیا،

قاضی نور۔ بیند چوکسے روئے تو گیرم سر راہش — تا ذوقِ تماشائے تو دزدم زنگاہش

جو شخص تیرا رخ زیبا دیکھکر آتا ہے، اس کو میں راستہ ہی میں پکڑ لیتا ہوں کہ اسکی نگاہوں سے ذوق تماشا یعنی تجھے دیکھنے کا لطف چرا لوں،

اردو کا اسی سے ملتا جلتا ہوا شعر ہے

ان کے جلوے کا تو کیا کہنا اگر — دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

ظہیری۔ ناظم زیاں نکرد اگر بندۂ تو شد — خود را فروختن بجو یوسف خریدن است

اگر ناظم تیرا غلام بن گیا تو گھاٹے میں نہیں رہا، تیرے ہاتھ اپنے کو بیچا یوسف کو خرید لیا یعنی اپنے کو بیچکر تیرا جیسا یوسف مل گیا،

جائے خوب است جہاں اہل جہاں خوب نیند — آہ ازیں خانۂ آباد کہ پُر ویران است

دنیا تو بہت اچھی جگہ ہے لیکن دنیا والے اچھے نہیں ہیں، وہ آباد گھر بھی کس قدر افسوس کے قابل ہے جو ویرانی سے معمور ہے یعنی دنیا اپنی ذات سے اچھی اور آباد ہے لیکن دنیا والوں کی برائی سے بالکل ویران ہے،

در خانقاہ وحدت ذکر مخالفت نیست — چوں تار سبحہ یکحرف از صد دہن بر آید

وحدت کی خانقاہ میں مخالفت کا کوئی ذکر نہیں ہے تسبیح کے تاگے کی طرح سیکڑوں منہوں سے ایک ہی بات نکلتی ہے یعنی سب دانے الگ الگ ہیں لیکن سب ایک تاگے میں پروئے ہیں،

مرزا منعم ...دہ مہربانیہائے صیاد سے — کہ از دامش اگر صد بار بگریزم دگر گیرد

میں صیاد کی مہربانیوں سے شرمندہ رہتا ہوں کہ اگر سیکڑوں مرتبہ اس کے دام سے نکل بھاگتا ہوں تو وہ پھر پکڑ لیتا ہے، گرفتاری کو صیاد کی مہربانی سے تعبیر کرنا حسن شاعرانہ ہے،

اقبال ببینید کہ آں دشمن جانہا — نیکی نہ کند باکس و بدخواہ ندارد

اس دشمن جاں کی یہ خوش نصیبی بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرتا پھر بھی اس کا کوئی بدخواہ نہیں ہے، (ہر شخص محبت ہی کرتا ہے)

مرزا عزت ناصح۔ بُرد مارا ہوس خام زرہ در پیری — راہ گم گشت بنزدیکی منزل مارا

پیری میں ہوس خام نے مجھے صحیح راستہ سے بھٹکا دیا اور منزل کے قریب پہنچکر میں راستہ بھول گیا یعنی زندگی کا اصل مقصد تو ترک ہوتی تھا لیکن پیری میں ہوا و ہوس نے اس راستہ سے ہٹا دیا، اس طرح جب موت کی منزل قریب آگئی تو اصل راستہ بھول گیا،

رہے از کوچہ شمع است تا کوئے فنا روشن — کہ قطع آں رہ از بال و پر پروانہ می آید

جو راہ شمع کے کوچہ سے فنا کے راستہ تک روشن ہے، وہ پروانہ کے بال و پر کے ذریعہ طے ہوتی ہے، یعنی جان دے کر ہی اس کو طے کیا جا سکتا ہے،

نسبتی تھانیسری۔ سخت می ترسم کہ من بسیار میخواہم ترا — آرزو خوب است لیکن ایں قدرہا خوب نیست

میں اس سے بہت ڈرتا ہوں کہ تجھ بے اندازہ محبت کرتا ہوں، یہ آرزو تو بہت اچھی ہے لیکن اتنی شدت اچھی نہیں ہے (کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا)

شب ہجرت شب دگر گون است — یک شب ہجر صد شب خون است

ترے ہجر کی رات اور دوسری راتوں کا مقابلہ نہیں ہے، تیری شب ہجر کا معاملہ ہی دوسرا ہے، ایک شب ہجر سیکڑوں شبخونوں کے برابر ہے۔

آنقدر جور کن کہ گر جائے — گفتہ آید کس اعتبار کند

تو اس قدر ظلم و ستم کر کہ جہاں بھی بیان کیا جائے کسی کو اعتبار نہ آئے،

زلف است و چشم وابرو و رخسار نسبتی — ایں چند فتنہ اند کہ دریک زمانہ اند

نسبتی محبوب کی آنکھیں اسکے ابرو اور رخسار اتنے فتنے ایک زمانہ میں جمع ہوگئے ہیں،

بعد مردن ایں قدر دانم کہ خواہی گفت حیف — تا کنم با او وفا عمرش وفاداری نکرد

اتنا مجھکو معلوم ہے کہ میرے مرنے کے بعد تو کہے گا کہ افسوس جب تک میں وفا کروں اسکی

عمر نے وفا نہ کی،

یاد رنمی شود کہ گہے ایں دلِ خراب — معمور بودہ است کہ ویرانہ کردہ اند

دل کی دنیا اتنی ویران ہے کہ اس کو دیکھکر یقین نہیں آتا کہ یہ کبھی آباد بھی تھا جس کو بعد میں

ویران کر دیا گیا۔ میر کا یہ شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے،

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا — کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

اے بیدلی نہ زبختی، تو خود بگو ست دگر دامن کہ گیرم — وا کہ چاک زدست تو در گریبان است

میرا گریبان تیرے ہاتھوں چاک ہوا ہے، یعنی میری دیوانگی کا سبب تو ہی ہے، ایسی حالت میں تو

خود بتا کہ تیرے علاوہ کس کا دامن تھاموں۔

ہیجرم برلب آمد جان بوصلم می دہی وعدہ — کسے را وعدہ دہ کو را امید زیستن باشد

ہجر سے میری جان لبوں پر آگئی ہے اور تو وصل کا وعدہ کر رہا ہے، یہ وعدہ ایسے شخص سے کرنا چاہئے

جس کو زندگی کی امید ہیں تو مرنے کے قریب آگیا ہوں، اس لیے اس وعدہ سے کیا حاصل،

نہ دارد کسی در زمانہ ہمنشیم ودر غم جز سایہ در پیکر خود — آں ہم چو بینم روئے او گرداند از من روئے خود

غم کے زمانہ میں میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی میرے پاس نہیں ہے، اسکا حال بھی یہ ہے کہ جب میں اسکی

طرف دیکھتا ہوں تو مجھ سے منہ پھیر لیتا ہے، منہ پھیر کر سایہ کی طرف دیکھنے سے لازمی طور پر اسکا منہ بھی پھر جاتا ہے،

تلخیص و ترجمہ

ایک عالمی طبی کانفرنس

بعض مسائل حاضرہ پر بحث

از ڈاکٹر محمد حسن محمود سعید

ترجمہ مولوی محمد ایوب صاحب اصلاحی استاذ مدرستہ الاصلاح سرائمیر

دنیا چاند تک پہونچ جانے کے خواب کی تکمیل پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی اور اپنی اس عظیم فتح کے نشہ میں مستقل سرشار رہے گی۔ دل کے مشہور سرجن ڈاکٹر وا نے ایک اخبار میں لکھا کہ "اس صدی میں انسان کی سب سے بڑی کامیاب علمی تحقیقات دو ہیں، (۱) چاند تک پہونچنا (۲) ایک شخص کا دل دوسرے شخص کے سینے میں لگا دینا" میں یہاں چاند تک پہونچنے کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرونگا کیونکہ دنیا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے اور اس کے اسپشلسٹ مجھ سے بہتر اس موضوع پر روشنی ڈال سکتے ہیں، البتہ میں دوسرے جز یعنی "دل کی قلم کاری" کو اپنی گفتگو کا موضوع بنانا چاہتا ہوں۔

اولاً تو ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے، بلکہ بہت سے

کامیاب آپریشنوں میں جن کا تجربہ (میڈریڈ) کے Concegclon اسپتال میں
کتوں پر کیا گیا، شریک رہا ہوں، دوسرے یہ کہ مجھے اس اولین عالمی کانفرنس میں
شرکت کا موقع ملا ہے جس میں سترہ ملکوں کے نمائندے شریک تھے۔ اور جس کا موضوع
بحث صرف دل کا بدلنا نہ تھا بلکہ دیگر اعضا مثلاً پھیپھڑے، گردے، آلات ہضم،
نظامِ اعصاب وغیرہ کا بدلنا بھی زیر بحث تھا، اس کانفرنس میں دنیا کے ممتاز
ماہرین کے ساتھ علمائے شریعت، ماہرین قانون اور شریعت کے مزاج آشنا ڈاکٹر
اور مذہبی لوگ بھی موجود تھے،

یہ کانفرنس اسپین کی حکومت کی طرف سے طلب کی گئی تھی اور اس کے منتظم
صدر مملکت فرانکو کے عزیز ڈاکٹر مارٹینز (Martinez) تھے جنھوں نے اسپین میں
سب سے پہلے دل بدلنے کی خدمت انجام دی، کانفرنس کا آغاز حکومت اسپین
کے صدر، وزراء، افسران اور سربراہان کلیسا کی موجودگی میں ہوا، اس کانفرنس
کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں دو سو سرکاری نمائندوں کے
علاوہ اس سے کئی گنا زیادہ سامعین و مشاہدین تھے اور اسپین کی پوری صحافت
کانفرنس کی تجاویز اور اس کی کارروائیوں کی رپورٹ لینے میں مشغول رہی ہیں اس
سادہ سی رپورٹ میں وہاں جو کچھ ہوا اسکا خلاصہ پیش کرونگا اور ان باتوں کا ذکر کرونگا جنھوں نے مجھے
ایک عرب مسلمان ہونے کی حیثیت سے آمادہ کیا کہ میں اس معاملہ کو اہمیت دوں
اور اس کانفرنس کی روداد لکھوں۔

کانفرنس کو آٹھ گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ان میں ایک گروپ قانونی
تشریع کا بھی تھا اس کے نمائندوں کی تعداد بارہ ۱۲ تھی ان میں زیادہ تر جج اور

بیرسٹر تھے، جو وزارتِ انصاف کی طرف سے اس لئے مقرر کئے گئے تھے کہ وہ
اعضا کی قلم کاری کے مسئلہ پر قانونی حیثیت سے غور کریں اور ارباب مذاہب
کی رایوں کی روشنی میں اس کے مسائل کا استنباط کریں، چنانچہ اس غرض کے لئے
مختلف مذاہب کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، کیتھولک فرقہ کی طرف
سے علماء کی ایک تعداد آئی تھی جس کے سربراہ روم کے Fuchs تھے اور فرانس
کا وہ راہب تھا جس کے دل کی پیوندکاری کی گئی تھی، اسی طرح آرتھوڈکس
اور پروٹسٹنٹ کے بھی بہت سے نمائندے آئے تھے، یہودی مذہب کی طرف
سے حاخام میڈرڈ اور تل ابیب کے حاخام اکبر بھی تھے، حکومت اسپین نے
مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے مراکش دعوت نامہ بھیجا کہ وہاں سے اسلام کے
نقطۂ نظر کی نمائندگی کرنے والے علماء بھیجے جائیں، چنانچہ وہاں سے شریعت کالج
کے دو پروفیسر آئے، اس کانفرنس میں نگاہیں مذہبی شخصیات اور ان عام
مشاہدین کی طرف لگی ہوئی تھیں جو دل کی پیوندکاری جیسے پیچیدہ مسائل کو تو
نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن اس بارے میں مذہب کی رائے جاننا چاہتے تھے اس
سے اسپین کے عوام کی مذہبی عقیدت اور کلیسا کی تعلیمات کی پابندی کا
اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے یہ مثال کافی ہوگی کہ جیسے ہی پوپ نے
مانع حمل گولیوں کے خلاف اپنی رائے شائع کی تو بازاروں اور
کارخانوں سے اس کی گولیاں اس طرح غائب ہوگئیں کہ تلاش کرنے پر
بھی نہ مل سکتی تھیں، حالانکہ اس سے پہلے وہ بہت عام تھیں، عوام کیطرح
ڈاکٹروں کو بھی مذاہب کے فیصلے معلوم کرنے سے بڑی دلچسپی تھی تاکہ وہ

آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں،

اس مسئلہ میں ارباب مذاہب کے فیصلوں کی بڑی اہمیت تھی، اسلئے ضروری تھا کہ میں کانفرنس سے پہلے بحیثیت ایک مسلمان کے مسلم مندوبین سے ملاقات کرکے کانفرنس میں زیر بحث موضوعات کے بارے میں ان کی رائے معلوم کروں کیونکہ یہ جو کچھ کہیں گے اخبارات میں شائع ہوگا، کانفرنس میں پیش ہوگا مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوں گے، لیکن مجھے یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوا کہ ایک صاحب نے کانفرنس شروع ہونے سے دو تین روز پہلے اپنی آمد کی اطلاع دی ہے اور دوسرے صاحب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا حالانکہ دعوت نامے کانفرنس شروع ہونے سے دو مہینے پہلے بھیج دئے گئے تھے، یہ لوگ اگرچہ اسلامی شریعت کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے، مگر کچھ ایسے دقیق طبی مسائل بھی درپیش تھے جن سے واقف ہونا ضروری تھا تاکہ ایک مسلمان عالم ان کے بارے میں اپنے مذہب کا صحیح فیصلہ بتا سکے،

ملیشیا کی حالیہ کانفرنس میں دل کی پیوندکاری کے متعلق مجمل طریقہ سے بحث ہوئی تھی لیکن اس کانفرنس میں نمایندگان مذاہب کو زیر بحث سوالات کا معقول اور مفصل جواب دینا تھا، حسن اتفاق سے اس وفد میں مجھے بھی شرکت ہونے کا موقع ملا، چنانچہ میں نے تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے اپنے خیالات رکھے اور طبی امور کی وضاحت کی اور کل مباحثوں میں حصہ لیا،

سوالات یہ تھے،

(۱) زندہ آدمی کے دوہرے اعضا مثلاً گردے اور پھیپھڑے میں سے کسی ایک عضو کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ بیچنا یا ہدیہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۲) کسی مردہ آدمی کے اکہرے اعضا (مثلاً دل اور جگر) کو کسی دوسرے زندہ آدمی کے حوالہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۳) اگر مرنے والے نے اپنی لاش کے متعلق کوئی وصیت کی ہو تو اس کی حیثیت کیا ہوگی؟

(۴) ڈاکٹروں کی طرف سے موت کے اعلان پر اتفاق یا عدم اتفاق؟

(۵) ان مذہبی دایوں کا احترام جو اعضا کی پیوندکاری کے خلاف ہیں،

(۶) تجربہ کے لئے زندہ آدمیوں کے اندر جزئی یا کلی طور پر اعضا کی پیوندکاری ممکن ہے یا نہیں؟

(۷) ایسے اشخاص سے معاملہ کی نوعیت کیا ہوگی جو Descerbrodos ہیں یعنی انکا دماغی مرکز اعصاب بے جان ہو چکا ہے، اور دوسرے اعضا مثلاً دل اور پھیپھڑے وغیرہ زندہ ہیں، طبی طور پر ایسے لوگوں کے اچھے ہونے کی کوئی توقع نہیں ہوتی اسلئے کہ انکا مرکزی نظام اعصاب بے جان ہو چکا ہوتا ہے،

(۸) دماغ کو جزئی یا کلی طور سے انسانوں کے اندر لگانے کے امکان پر غور وخوض، عورت کے خصیۃ الرحم اور مردوں کے خصیتین کی پیوندکاری کے عنوانات پر بحث،

مختلف مذاہب کے نمائندوں نے مذکورہ بالا مسائل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا انکا خلاصہ حسب ذیل ہے.

۱. مسیحی اور یہودی علما نے زندہ اشخاص کے دوہرے اعضا میں سے ایک عضو کو کسی دوسرے زندہ شخص کو بلا قید و شرط ہدیہ کر دینے کی اجازت دیدی اور بیع کے متعلق یہود نے کہا کہ وہ ہو سکتی ہے، کیونکہ بائع کا شخصی معاملہ ہے، البتہ عیسائیوں

میں اختلاف ہوگیا مگر بیع کو جائز ٹھہرانے والی رائے بعض تحفظات کے ساتھ غالب
رہی، ان کے اکابر علماء میں سے کسی نے کہا کہ جو چیز دی جاسکتی ہے وہ بیچی بھی جاسکتی
ہے ایک صاحب نے فرمایا کہ اعلانیہ بیع کی اجازت نہ ہوگی تو خفیہ خرید و فروخت
ہونے لگے گی، اس کی انھوں نے یہ مثال دی کہ جہاں فحاشی کے گھروں کے قیام کی
اجازت نہیں ہے وہاں خفیہ طور سے کاروبار جاری ہے،

اس مسئلہ میں ہم لوگوں کی رائے بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھی کہ انسان کی
زندگی تنہا اس کی ملکیت نہیں بلکہ وہ خدا اور سماج کی ملک ہے اس لئے کسی شخص
کو اپنی خواہش کے مطابق اپنے جسم پر کوئی تصرف کرنا جائز نہیں ہے ایسا کرنے میں
ضرر عظیم بھی ہے، ہم نے اس سلسلہ میں خودکشی کی مثال دی کہ خودکشی کرنے والا
اسلام کی نگاہ میں مجرم ہے، اسے دنیا میں بھی سزا ملی اور آخرت میں بھی وہ جہنم
میں جائے گا۔

بیع کے متعلق ہمارا جواب یہ تھا کہ اسلام کی نگاہ میں انسان کے جسم کی کوئی
قیمت نہیں لگائی جاسکتی، اسلامی شریعت اسے قطعی ناپسند کرتی ہے اور ہم نے اس
پادری کی تردید کی جس نے خفیہ کاروبار کے اندیشے سے بیع کی اجازت کا مطالبہ
کیا تھا، ہم نے کہا اسلام شر کا مقابلہ شر سے نہیں کرتا، وہ زنا کی خفیہ اشاعت
کے ڈر سے فسق و فجور کے گھروں کی اجازت نہیں دے سکتا جو صریحاً حرام ہے،
عدم جواز بیع کے متعلق ہماری اس رائے پر بڑا ہنگامہ ہوا، کانفرنس کے اکثر لوگوں
نے ہماری تائید کی جن میں عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر Dausez فرانسیسی اور
ان کی بیگم تھیں، انھوں نے تو خون کے بیع کی ممانعت کا بھی مطالبہ کیا اور بتایا کہ

وہ فرانس میں ممنوع ہے، البتہ خون کا ہدیہ کرنا صحت مند لوگوں کے لئے اختیاری بات
ہے بیع کی ممانعت اس احتیاط کی وجہ سے ہے کہ لوگ مادی منفعت کی خاطر اپنے آپ کو
ہلاک نہ کریں، کچھ لوگوں نے ان کی رائے مسترد کردی اس پر وہ اس قدر ناخوش
ہوگئے کہ کانفرنس چھوڑ کر چلا جانا چاہتے تھے، انھوں نے مجھے تاکید کی کہ میں عدم بیع
کی پوری قوت سے حمایت کروں، بیع کی اجازت کی قرارداد ایک ایسا المیہ
ہوگی جس سے نتائج بڑے خطرناک ہونگے،

(۲) دوسرے سوال پر کہ مردہ شخص کے اکہرے عضو کو کسی زندہ شخص میں منتقل
کیا جائے یا نہیں تو ہر نقطۂ نظر کے لوگ متفق تھے، بشرطیکہ یہ بات قطعی طور سے طے ہوچکی
ہو کہ وہ شخص مرچکا ہے، ہم لوگوں نے یہ ترمیم پیش کی کہ ان کے لئے کسی شخص کا مرجانا
ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری قرار دیا جائے کہ بیمار کے لئے اس عضو کاری
کے سوا علاج کی کوئی اور صورت نہ رہ گئی ہو اور اس سلسلہ میں اس مریض کی رائے
بھی ضرور لی جائے، اور جو ڈاکٹر اس عضو کاری کا ذمہ دار ہو وہ اس کا اسپیشلسٹ
اور پورا تجربہ کار ہو، تمام آلات و وسائل بھی مہیا ہوں۔

(۳) لاش کے بارے میں یہود کی رائے تھی کہ وہ مقدس ہے اس لئے کسی کی ملکیت
نہیں ہوسکتی، مگر ان کے بعض اکابر نے خاص حالات میں اس کے خلاف رائے
دی مگر یہ شرط قرار دی کہ لاش متوفی کے ورثا اور اقرباء سے حاصل کی جائے، عیسائی
علماء کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ لاش کسی کی ملکیت نہیں ہے لیکن اگر میت کی کوئی وصیت
ہو تو اس کا احترام کرنا ضروری ہے اور وصیت نہ ہو تو خاندان اور قرابت داروں
کی رائے لینا ضروری ہے، اس سلسلے میں ہم ان سے متفق تھے، مگر اس کی یہ قانونی وضاحت

بھی کر دی کہ اسلام میں قرآن، سنت، اجماع، قیاس اور اجتہاد کے ساتھ ایک اور چیز ہے جسے مصالح مرسلہ یا استحسان کہتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس میں کوئی عمومی فائدہ ہو، اور اس کا قرآن و سنت کے ساتھ کوئی تعارض نہ ہو تو اسے بھی قانونی حیثیت حاصل ہوگی اس بنیاد پر مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کو یہ حق ہے کہ وہ علمی ریسرچ کے لئے ناگزیر لاشوں کو تصرف میں لانے کی اجازت دے سکتا ہے، اسی طرح ضروری اعضا کو کاٹ کر محفوظ کر لینے اور بوقت ضرورت انسانی فائدہ کے لئے ان کو استعمال کرنے کی بھی اجازت دے سکتا ہے اس سے مستقبل میں اعضا کی قلم کاری عام ہو سکتی ہے، جس سے صرف دولت مند ہی نہیں بلکہ غریب طبقہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، اسی طرح زندہ شخص کے دوسرے اعضا میں سے ایک عضو کو دوسرے زندہ شخص کو دیدینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے،

ہماری اس رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اور علمی دنیا میں فی الواقع یہ ایک انقلابی نظریہ تھا، کیوں کہ دوسرے مذاہب اس کی اجازت نہیں دیتے ہم نے ثابت کیا کہ اسلام میں مفاد عام کو اولین اہمیت حاصل ہے، مغربی دوستوں نے اس پر احتجاج کیا مگر جب ہم نے اس کے جواز کے بارے میں وضاحت کی تو وہ لوگ مطمئن ہو گئے، مگر انھوں نے کہا کہ اس معاملہ کو فلاں حاکم یا فلاں بادشاہ کے حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے، ہم نے عرض کیا کہ ہم لوگ یہاں سب سے پہلے ایک خالص مذہبی معاملہ پر باہم گفتگو اور مذاکرہ کر رہے ہیں، رہا فلاں یا فلاں تو وہ ہمارے سوچنے اور طے کرنے کی چیز ہے، بہت سے خصوصی ڈاکٹروں نے اس قرارداد کو پاس کرنے کی اہمیت محسوس کی،

(۴) اعلان مرگ کے بارے میں ہمارا اور دیگر مذاہب کا نقطۂ نظر ایک تھا کہ اس کا تعلق ڈاکٹروں سے ہے، البتہ یہود، اطباء کی رائے کے ساتھ ساتھ ذاتی حیثیت سے انقطاع تنفس کو ایک دینی و روحانی حیثیت دیتے رہے جیسا کہ ان کے لاہوت میں مذکور ہے،

(۵) پانچویں مسئلہ میں سب متفق الرائے تھے کہ ان مذہبی رایوں کا پورا احترام کیا جائے جو اعضا کی قلم کاری کے خلاف ہیں،

(۶) چھٹا مسئلہ دیگر مذاہب کے درمیان مختلف فیہ رہا، مگر ہماری رائے طے شدہ تھی کہ اسلام میں علاج کے سوا کسی اور غرض سے اعضا کی قلم کاری حرام ہے، قلم کاری کا مقصد وحید علاج ہے اور اس کا تعلق تمام تر اس ڈاکٹر کے ضمیر پر ہے جو اس کام کا ذمہ دار ہے،

(۷) ساتواں مسئلہ یعنی ایسے گم صم لوگوں کو جن کی شفایابی کی کوئی امید نہیں، دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا، ایک وہ جنھیں مخصوص آلات کی ضرورت نہیں، وہ سانس لے سکتے ہیں، کھانا کھا سکتے ہیں، اور اکیلے اپنے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو سکتے ہیں ایسے لوگوں کو آدمی سمجھا جائے گا جنھیں زندہ رہنے کا حق ہے، دوسرے وہ ہیں جو کھانے اور سانس لینے کے لئے آلات کے محتاج ہیں، ان کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے اس لئے ان کا شمار زندہ آدمیوں میں نہیں ہوگا، کیتھولک فرقہ کے لوگ اس کی زندگی کی حفاظت کو ضروری نہیں سمجھتے، یہود نے بتایا کہ ایسے شخص کو جس سے کوئی فائدہ ہی نہ ہو تلمود زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا، ہم لوگوں نے کہا کہ ایسا معذور شخص اگرچہ اعصابی حیثیت سے مردہ ہے لیکن دوسرے اعتبارات سے زندہ ہے اور یہ تقسیم ایک کی حفاظت

کرتی ہے اور دوسرے کی حفاظت کو ضروری نہیں سمجھتی اس لئے ہم لوگوں نے کہا کہ
اسلام بقدر استطاعت تمام وسائل کے ساتھ انسانی زندگی کا تحفظ چاہتا ہے. نطفہ
قرار پانے سے لے کر زمین پر زندگی کے خاتمے یعنی اس کے تمام اعضاء کے مردہ ہو جانے تک
اس لئے ہمارے نزدیک یہ اپاہج بھی ایک زندہ انسان ہے، اس کی دو قسمیں
نہیں کی جا سکتیں اگر افراد اس کی سرپرستی نہ کر سکیں تو اسلامی حکومت کفالت
کرے گی اور اس کی زندگی کے تحفظ کی ذمہ دار ہو گی، ہماری اس رائے پر اچھا خاصا
ہنگامہ رہا مگر عوام کے سامنے یہ بات عیاں ہو گئی کہ اسلام انسانیت سے محبت کرنے
والا مذہب ہے،

میں بڑی صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ میں اس بارہ میں برابر متردد رہا کیونکہ ایسا مریض نئی
تعریف کی رو سے مردہ ہے، کیونکہ اس کے مرکزی اعصابی نظام میں کوئی زندگی
باقی نہیں ایسی حالت میں ہمارے علمائے کرام کے نزدیک ہماری یہ رائے اسلام کے مطابق تھی

آخر میں اعضائے تناسل، آلۂ عصبی اور خصوصاً دماغ کی قلم کاری کے امکان پر
بحث ہوئی، بعض عیسائیوں نے اسکی اجازت دیدی اور کہا کہ اس پیوند کاری کا
اور دیگر اعضا کی پیوند کاری میں کوئی فرق نہیں لیکن یہود نے کہا کہ یہ مسئلہ نیا ہے اور وہ اس
بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتے، ہماری رائے نہایت واضح تھی کہ یہ عمل قطعاً ممنوع ہے،
اسوقت جبکہ اس کارروائی کے نتیجے میں آدمی کی شخصیت تبدیل ہو جاتی ہو جیسا کہ دماغ کی قلم
کاری میں ہوا کرتا ہے، اسیطرح اعضائے تناسل اور خصیتین کی قلمکاری اس شخص کو جس پر اس
قلم کاری کا عمل ہوا ہے ایسا کر دیگی کہ اس سے جو نسل وجود میں آئے گی اسکی جانب منسوب نہ ہو گی
بلکہ اسکی طرف منسوب ہو گی جس سے یہ اعضاء لئے گئے ہیں اسلئے ہمارے نزدیک یہ عمل مصنوعی تلقیح کے
مشابہ ہے اور وہ اسلام میں حرام ہے۔ (الوعی الاسلامی کویت)

باب التقریظ والانتقاد

دیوان سراجی خراسانی

از جناب ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

سراجی خراسانی کا تعلق شعراء و ادبا کی اس ابتدائی نسل سے ہے جو قطب الدین ایبک
(م ۱۲۱۰ء) اور اس کے جانشین شمس الدین التتمش (م ۱۲۳۶ء) کے عہد میں ہندوستان
آئے اور شعر و ادب میں فضیلت و بزرگی کے باعث سلاطین و امراء کے درباروں سے وابستہ رہے
مگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں اس دور کے بیشتر آثار خصوصاً شعراء و ادبا کی شعری و ادبی یادگاریں
ناپید ہو چکی ہیں اور جو محنت و کاوش سے دستیاب ہو سکتی ہیں وہ بھی ہماری علمی سہل انگاری
کے باعث گوشۂ گمنامی میں ہیں اس لئے ان ارباب کمال کے حالات اور کارناموں پر
بھی پردہ پڑا ہوا ہے، خوشی کی بات ہے کہ ملک کے نامور محقق و ادیب پروفیسر نذیر احمد
صاحب رئیس قسمت فارسی دانشگاہ اسلامی علی گڈھ نے اسکی طرف توجہ کی ہے، اور اس
دور کے متعدد گمنام شعراء و ادبا اور ان کی تخلیقات کو علمی حلقوں میں روشناس کرایا جو ان کے
مطالعہ کی وسعت اور محققانہ ژرف بینی کی دلیل ہے، حال ہی میں انھوں نے اس دور کے
ایک شاعر سراجی خراسانی کے دیوان کا ایک نادر و نایاب نسخہ دریافت کیا ہے، جسے تصحیح و
تحشیہ کے ساتھ دانشگاہ اسلامی علی گڈھ نے شائع کیا ہے، یہاں اسی دیوان کا تعارف مقصود ہے،

دیوان کی کمیابی کے سبب سے تذکرہ نگاروں میں سراجی کی شخصیت متنازعہ فیہ تھی، اس کے دیوان کی اشاعت کے بعد اس کی شخصیت سے پردہ اٹھ گیا ہے، سراجی کا پورا نام سید سراج الدین اور سراجی تخلص تھا، خراسان کا رہنے والا تھا،

من ثنای تو بالفاظ خراسان گویم　　　　که مرا آب و گل از خاکِ خراسان برخاست

اس نے ابتدائی تعلیم خراسان اور ہرات میں حاصل کی، اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اسے شعر و ادب کے علاوہ علم نجوم، حکمت اور رمل میں بھی عبور حاصل تھا،

هم منجم، هم حکیم و هم رمال هم ادیب　　　　وانگهی از خاندان مذکور اقران و جهان

شاعری کے ساتھ اسے نثر پر بھی پوری قدرت تھی، اور اس میں اس کا اپنا منفرد اسلوب تھا،

در نظم و نثر شاها امروز بی نظیرم　　　　با نثر جان فزایم با نظم دلپذیرم

مدت تک کرمان کے حکمراں تاج الدین ابو المکارم کے دربار میں ملک الشعرائی کے منصب پر فائز رہا، وہاں سے سلطان جلال الدین ابو الفتح سالار کی خدمت میں سیستان پہنچا، یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد ہندوستان چلا آیا، اس وقت سلطان شمس الدین التتمش دلی کے تخت پر متمکن تھا، سلطان اور اس کے شہزادوں اور امرار کی فیاضانہ سرپرستی اور قدردانی سے دلی میں شعراء و ادبا کا اجتماع تھا، تاج الدین بخاری، شہاب الدین مہمرہ، عمید الدین سنامی جیسے نامی گرامی قصیدہ گو شاعر دربار میں موجود تھے، سراجی نے ولیعہد شاہزادہ ناصر الدین محمود کی خدمت اختیار کی، اور التتمش کے وزیر نظام الملک جنیدی اور اس کے خاندان کے بعض افراد سے بھی اسکے تعلقات پیدا ہوگئے، انھوں نے بھی سراجی کی بڑی قدردانی اور ہمت افزائی کی، سراجی کے بیشتر قصائد انھیں سلاطین و امرار کی

مدح میں ہیں، جن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ساتویں صدی ہجری میں قصیدہ گوئی کا کمال سمجھی جاتی تھیں،

سراجی کی شہرت زیادہ تر ایک قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے ہے، دیگر اصنافِ سخن اس کے دیوان میں نہیں ہیں، قصیدہ گوئی میں اس نے متقدمین میں ایرانی شعراء قطران (م ۴۶۵ھ) عمعق (م ۵۴۲ھ) حسن (م ۵۵۶ھ) سوزنی (م ۵۶۹ھ) انوری (م ۵۸۵ھ) مجیر (م ۵۸۶ھ) اور خاقانی (م ۵۹۵ھ) کی پیروی کی ہے، اور معاصرین میں ہندوستانی شعراء بخاری، مہمرہ اور سنامی سے خاصا فیض اٹھایا ہے، اس کے دیوان میں ایک سو دو قصائد، ایک مسمط اور چھ ترجیع و ترکیب بند ہیں، قصیدوں میں آٹھ قصیدے مرصع یا مصنوع ہیں، بقیہ غیر مرصع، مرصع قصائد کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک قسم تو ان قصیدوں کی ہے، جن میں "لزوم مالا یلزم" کی صفت کا استعمال ہے، مثلاً تین قصیدوں میں "چشم" اور "روی" کا التزام ہے، اسی طرح ایک قصیدے میں "موی" اور "مو"، ایک میں "بر" اور "دست"، ایک میں "لعل"، "سیم" اور "زر" اور ایک میں "خاک"، "باد" اور "آتش"، کا التزام ہے، مثال کے طور پر دو قصیدوں کے چند اشعار درج ہیں:

ای مه خورشید روی دلبر بادام چشم　　　　هست بر رویت ز ابروی نجم بادام چشم

خون چشم روی من بر گونه عناب کرد　　　　در غم روی تو ای شکر لب و بادام چشم

با جفای چشم تو گر روی سیم اندام کیست　　　　کو وفا دارد ز تو گر روی سیم اندام چشم

تا نه بیند چشم من روی ترا در کوی تو　　　　گه ببوی در نهم روی و گه بر بام چشم

در فراق چشم و روی تو بامید وصال　　　　روی آنم کو که دارم از تو یک پیغام چشم

چشم من بی روی تو تا بی بی آرام شد　　　　کی بود در روی خود بی آب بی آرام چشم

شاه روی ترا با چشم خوش در بزم عشق　　　　جرعه دان روی مست و باده اشک و جام چشم

بر متاب از چشم من روی صنم یکدم بلطف — تا شود از روی تو ہمچو زباں در کام چشم
جان و دل از چشم و رویت با نصیب وافرند — چوں ز روی خاک پای آمد ایام چشم
روی ملک شہ نظام الدین محمد چشم شرع — آنکہ ہرگز نفگند رویش بنا فرجام چشم

تا پدید آمد خط چوں مور بر گلنار یار — ہمچو موی گشتم اندر عشق آں زیبا نگار
مور اگر گوید سخن پس آں منم در ہجر دوست — موی اگر دارد رواں پس آں منم در عشق یار
مور دیدی کش بود بر دل ز ہجراں کوہ غم — موی دید کش بود دامن زخوں دریا کنار
آں منم چوں مور بر دل از غم او کوہ کوہ — آں منم چوں موی دا تنکم موج موج اندر کنار
گرچہ بر من عشق او دارد جہاں چوں چشم مور — کم مبادا یکسر مو از سر آں گلعذار
شد تنم تا دیدم آں خطی چو پای مور چہ — ہمچو موی اندر آب نے عفراں زرد و نزار
موی مشکیں خط او در گرد رخسارش نگر — بر گل سوریست گفتی خیل مور اندر قطار
ای ز زلف دل بموی آویختہ بس خوں شدہ — در ہوائے شکرت با حرص مور از انتظار
عنبر خالت نہاں شد زیر آں خط چوں مور — تا شد از روی چو ماہت موی مشکیں آشکار
بنگر اندر اشک من کز عشق مویت شد رواں — گر ندیدستی رواں از چشم موری چشمہ سار
گرچہ اک موی ز دوست کمترم ہستم عزیز — ہمچو آں مور سلیماں پیش صدر کامگار
صاحب اعظم قوام الدین کہ مور در گہش — ہست نزد خسرواں ہمچو موی جاناں بردبار

دوسری قسم میں دوسری صنعتوں خصوصاً "رد العجز علی الصدور" جمع و تقسیم اور تجنیس مکرر کی صنعتیں ہیں، مثلاً

می بعیدی گر ترا ساقی بسیں بر دہد — شاخ عشرت مر ترا در باغ عیدی بر دہد

باغ عیدی بر دہد ہر گہ کہ یاری بر بری — ساغرے در دست تو با بچہ بر بر دہد
بچہ بر بر خوش آید خاصہ در ایام عید — ہر قدح کاندر کفت آں بچہ بر بردہد

(رد العجز علی الصدور)

بر زلف و چشم و بر رخ ہست آں خجستہ نگار — یکی بنفشہ دوم نرگس و سوم گلنار

عقیق و نرگس دلبر جمال و قامت جاناں — یعنی چار در چار ند من بید انجم آساں
یکی نوش است در شکر دوم زہر است گوہر — سوم ماہست در جوزا چہارم سرو در تاباں

(جمع و تقسیم)

ماہست شہرہ شہرہ ز خورشید شہر تر — رخسار طرفہ طرفہ آں سرو سیم بر
زاں شہرہ شہرہ شہرہ بلغار لی شہرت — زاں طرفہ طرفہ طرفہ نوشاد بی خطر

(تجنیس مکرر)

ان قصیدوں میں سراجی نے پوری استادی اور مہارت کا ثبوت دیا ہے، جس سے اس کی زبان دانی اور اظہار بیان پر قدرت کا پتہ چلتا ہے، اس کے غیر مرصع قصائد میں جو تعداد میں بھی زیادہ ہیں الفاظ کی شوکت، ترکیبوں کے حسن، زبان و بیان کی صفائی، رفعت خیال، جدت ادا، مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی کے ساتھ ساتھ بے ساختگی، برجستگی اور روانی بھی پائی جاتی ہے، اس نے خطابیہ اور تمہیدیہ دونوں طرح کے قصیدے لکھے ہیں اور دونوں میں کامیاب ہے خصوصاً تمہیدیہ قصیدوں کی تشبیب میں تغزل اور بڑی شیرینی ہے، ان میں کبھی وہ مناظر فطرت کی عکاسی کرتا ہے، اور کبھی محبوب سے خطاب اور اس کی تعریف کرتا ہے، ان کو اگر قصیدوں سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو غزل مسلسل کا لطف دیتے ہیں، ان قصیدوں کی گریز میں اسنے بڑی استادی اور مہارت دکھائی ہے، جو نہایت موزوں اور برجستہ ہیں، تشبیب اور مدح کے درمیان

ایک ناگزیر کڑی معلوم ہوتے ہیں، اسکی چند مثالیں خالی از لطف نہ ہوں گی،

دوش گفتم طبع را ای گوہر کانِ ہنر
کیست آں آصف دلی کو شد سلیمانِ ہنر

مشتری نی و عطارد نی کہ در جوزای فضل
ہست طبعِ روشنش خورشیدِ رخشانِ ہنر

از معانی و عبارت با حلی و با حلل
نو عروسِ خاطرش اندر شبستانِ ہنر

تا بہشتِ کامرانی از ہنر زینت گرفت
در بہشتِ کامرانی اوست رضوانِ ہنر

مقتدای اہلِ معانی شد از آں معنی کہ او
شافعیِ عالمِ علمست و نعمانِ ہنر

پیشوای عالم بالا عطارد کانِ فضل
پیر و شاگرد داد زید ہبیرہ لانِ ہنر

ذہنِ او کز طبع او جزو یست علمِ کائنات
گوشِ عقلِ کل بمالد در دبستانِ ہنر

باخرد گفتم بگو کیں وصف را موصوف کیست
گفت مخدومِ تو شمعِ جمعِ اعیانِ ہنر

صدرِ دریا دل عزیز الدین عزیزِ مصرِ فضل
یوسفِ صدرِ جلال و پیرِ کنعانِ ہنر

صبحدم چوں التماسِ سندس بزیوں رسید
از شعاعِ مہر گردوں را لباس اکنوں رسید

کرد طاسِ آسماں از زیبق انجم تہی
ترکِ چینِ صبح چوں با طشتِ پر الوں رسید

نو عروسِ حجرۂ تقدیر یعنی آفتاب
از شبستانِ قضا بر طارمِ گردوں رسید

در چنیں وقتی من اندر کنج خانہ می بدست
ہر زماں از گنجِ طبعم لولوی مکنوں رسید

اندر آمد از درم چوں آفتابِ اندر شرف
ترکِ سیمیں ساقِ من در ساعتِ میموں رسید

گفت خیز ای بی خبر از کارہای روزگار
روزگارِ دیگر آمد عیشِ دیگر گوں رسید

ہر کسی در کارِ استقبالِ و تو در کارِ آب
کارِ آب از کف بنہ کت آب کار اکنوں رسید

تہنیت را خدمتی ترتیب کن در راہِ گنگ
رایتِ سنجر شہی بر طالعِ میموں رسید

شہ معز الدین کہ کمتر قطرہ از ابرِ کفش
ربعِ مسکوں را فرات و دجلہ و جیحوں رسید

کسی را در ہمہ عالم چو یارم یار کی باشد
برنگِ لالہ رویش گل و گلنار کی باشد

دہانِ یار تنگ آمد مرا اندر ہوای او
دلی تنگست لیکن چوں دہانِ یار کی باشد

سخن گویند یارانم ز کشمیری و تاتاری
چو یارم یار در کشمیر و در تاتار کی باشد

ہزاراں جان و دل در پیش باز ارزش لیکن
بجز جان و دلم کاسد دراں بازار کی باشد

بسوی عاشقان او ز قوسِ ابروان چشمش
اگر صد ناوک اندازد یکی بیکار کی باشد

دو عنابست آں لبہای او زو شکر ہمی بارد
بجز آں ماہ را عناب شکر بار کی باشد

چو طاؤس خرامانست نی نی من غلط کردم
کہ طاؤسِ خراماں را چناں رفتار کی باشد

بمہر و ماہ می مانَد چہ میگویم خطا گفتم
کہ مہر و ماہ را لعلِ شکر گفتار کی باشد

رخش بغداد و حسنست درو طرار زلفِ او
ببغداد اندروں ہرگز چناں طرار کی باشد

دلم زنہار جویاں شد سوی زلفین طرارش
وزاں زلفینِ طرارش در از زنہار کی باشد

دو چشمم چار شد از غم کہ از بہر سہ بوسِ او
لبم را بر لبش یکدم رہِ دو چار کی باشد

بعیاری یارا بر وآں عیار یار من
بجز عیار یارِ من بتِ عیار کی باشد

دو جزعم گہرہا ریزد ز عشقِ لعلِ نوشینش
ولیکن چوں دو دستِ شاہ گوہر کی باشد

خداوندِ خداوندانِ گیتی دار تاج الدین
کہ چوں او در جہاں بختِ گیتی دار کی باشد

کار دلم بعشقِ تو دشوار می رود
کز حسن در زمانہ ترا کار میرود

بازارِ مہر روی چو ماہت بر رونق ست
کز چرخ مشتریش خریدار میرود

در جیب دکیسۂ دل کس نقد صبر نیست   تا کارہ آں دو طرۂ طرار میرود

جانرا بمن یزید بلا می برد ز عشق   ہر دل کہ با غم تو بہ بازار میرود

رنگ رخت بگونۂ گلنار شد پدید   اشکم ازاں بگونۂ گلنار میرود

در باغ عارض تو دلم شد چو عندلیب   نالاں ز بس کہ بر گل گلزار میرود

گر دل نمیرسد بوصال تو دیدہ را   از دور با جمال تو دیدار میرود

اشکم چو لعل و تن چو شکر اندر آب چشم   زاں آبدار لعل شکر بار میرود

جور و جفای شحنۂ غم بر دلم مدام   وز غمزہ آں دو غمزۂ خونخوار میرود

چندیں جفا و جور مکن زانکہ راز ما   در بارگاہ شاہ جہاندار میرود

سلطان ملک مشرق شہزادۂ جہاں   کز ہیبتش سپہر نگونسار میرود

اس کی تشبیہات و استعاروں کی لطافت دلکش ہے، سراجی کی فنکارانہ بصیرت کا ثبوت ملتا ہے، جنہیں اس نے زیادہ تر تشبیب یا مدح میں استعمال کیا ہے ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

شکل شب ہلال نو بود چنانکہ دلمی   در صف جنگ برکشد ناچخ روشن ازمیاں

چرخ چوں بحر منجمد شکل ہلال نو در و   راست بشبہ ماہی گاہ ستادہ کہ دواں

دیدم در رفت ماہ نو سوی غروب من شدم   سوی مہ تمام خود از پی تہنیت رواں

ماہ تمام خویش را دیدم و چیزی شدم   در افق کنارہ او چو مہ نو در آسماں

روی چو ماہ را ز زیر نقاب عنبری   قد چو سرو سرد او زیر وطای پرنیاں

لعل چو نوش نوش او دار دی در عاشقی   زلف چو مشک مشک او دوام بلای عاشقاں

چو لعبتان حصاری زنوفہ ہفت حصار   بر آمدند کواکب ز روی چرخ بریں

بنات النعش تو گفتی کہ ناقۂ صالح   بر آمد از دل خارا بمعجزات مبیں

چو ہفت مہرۂ سیمیں دہان حقۂ چرخ   نمود پیش دو پیکر ز خوشۂ بر دیں

مجرہ ہمچو طریقی بگلستان اندر   بر آں طریق کواکب چو سوسن و نسریں

شب چنیں و من اندر نشاط ماہ نو   نہادہ تیر گماں جست بر کمان یقیں

خبر شنید نگار من و تر حسل من   کہ اسپ عزم مصمم کشیدہ ام در زیں

چو مشتری بکمال و چو ماہ در سرطاں   در آمد از درم آں آفتاب زہرہ جبیں

مشکل اور سنگلاخ قافیوں میں بھی اس نے خوب شعر نکالے ہیں، اس کے یہاں قدیم اور متروک الفاظ و اصطلاحات کی فراوانی ہے، اس کے باوجود شگفتگی و دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، سراجی کو اس کے عہد کے اعتبار سے صف اول کے اور بحیثیت مجموعی صف دوم کے قصیدہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے،

دیوان اپنی شعری و ادبی خصوصیات کے علاوہ تاریخی و ثقافتی اعتبار سے بھی اہم ہے، اس کے قصیدوں سے ازمنۂ وسطیٰ کی بعض اہم شخصیتوں کے حالات اور اس دور کے بعض تاریخی واقعات کے بارے میں خاصی معلومات فراہم ہوتی ہیں، جو ابتک مورخین پر واضح نہیں تھیں، خصوصاً نمکران کے حکمراں، شہزادوں، امرار اور دوسری سر برآوردہ شخصیتوں پر خاصی روشنی پڑتی ہے، نمکران کی سلطنت بارہویں و تیرہویں صدی عیسوی میں قائم تھی، اس کا بانی سلطان تاج الدین ابوالمکارم تھا، جسے منہاج سراجی صاحب طبقات ناصری (صفحہ ۱۲۵-۸۲) سلطان غیاث الدین محمد بن سام اور اس کے بھائی سلطان معز الدین محمد بن سام غوری کے امرار میں شمار کرتا ہے، لیکن تفصیل نہیں دی، سراجی کے قصیدوں سے واضح ہوتا ہے کہ تاج الدین نمکران کا حکمراں اور اس کا بھائی نصرت الدین اقتدار میں برابر کے شریک تھے، گویا حکومتی معاملات میں وہ ہندوؤں کے "مشترکہ خاندانی نظام" (Joint family-Systanem)

پر کار بند تھے، سراجی کہتا ہے،

تاجہاں باشد بکام دین و شہ باد اجہان تاج دین بر تخت ملک شاہ نصرت ہمبرش

اسی طرح سلطان التمش کے لائق وزیر نظام الملک جنیدی، اس کے لڑکے اور خاندان کے دوسرے افراد کے مدحیہ قصیدوں سے اس خاندان کی بلند پایگی اثر و رسوخ اور علمی و ادبی سرپرستی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، جنیدی خاندان کے متعدد افراد سلطنت کے کلیدی عہدوں پر فائز تھے اور اپنی غیر معمولی فیاضیوں کے لئے مشہور تھے، انھوں نے شعراء و ادبا کی بڑی قدر دانی اور سرپرستی کی جو ابتدائی عہد سلطنت میں ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی ترقی میں بہت مفید ثابت ہوئی،

یہ دیوان ذخیرہ جیب گنج مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ اور پروفیسر سعید نفیسی (ایران) کے نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے، فاضل مرتب نے معلوماتی مقدمہ کے ساتھ، تعلیقات اور مشکل الفاظ و اصطلاحات کے معانی کی وضاحت کی فہرست بھی دیدی ہے، جس سے اسکی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے، خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائپ میں چھپا ہے، قیمت چالیس روپے، ہے، جو اس کی افادیت اور ظاہری خوبصورتی کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہے،

تعمیر حیات

(شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کا آرگن)

یہ پندرہ روزہ اخبار اسی شعبہ کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے، اور اپنے قارئین کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس اور انکو مسلمان ملکوں کے حالات و واقعات سے باخبر کرتا ہے، اہل دل کے ایمان افروز حالات و ملفوظات کے ساتھ ایمانی جذبہ اور اسلام کی داعیانہ خصوصیات بھی بخشتا ہے، آسان با دلکش بیان، مفید معلومات، دیدہ زیب باتصویر سر ورق اسکی خاص خصوصیت ہے،

مینجر تعمیر حیات
دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ،

مطبوعات جدیدہ

مکاتیب گیلانی :- مرتبہ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۹۹ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اعلیٰ مجلد قیمت آٹھ روپے پلاسٹک کور دس روپے۔ پتہ دار الاشاعت رحمانی خانقاہ مونگیر،

مولانا مناظر احسن گیلانی میں علم و عمل ذہانت و ذکاوت وسعت معلومات و دقت نظر نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی اور جذب و سلوک کی جو جامعیت تھی، اس کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں، ان کی تحریروں میں یہ ساری خصوصیات نظر آتی ہیں، جز سے ان کے مکاتیب بھی خالی نہیں ہیں، خصوصاً وہ خطوط جو انھوں نے اپنے معاصر اہل علم کو لکھے ہیں، مختلف النوع معلومات کا خزانہ ہیں ضرورت تھی کہ افادۂ عام کے لیے ان خطوط کو مرتب کر کے شایع کیا جائے، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی تلاش و جستجو سے یہ خطوط فراہم کر کے ان کی پہلی جلد شایع کی ہے، اس میں چند خطوط کو چھوڑ کر جو ان کے ابتدائی دور کے ہیں باقی کل خطوط انکے رفیق خاص مولانا عبد الباری صاحب ندوی اور حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں، ان خطوط میں انکے سارے رنگ نمایاں ہیں، اور وہ اپنے گوناگوں معلومات کے لحاظ سے اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں، کتاب کے شروع میں مولانا عبد الباری صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مولانا کی سیرت و کردار کے ساتھ بہت سے مفید دینی و علمی معلومات اور مسائل آگئے ہیں، اسلئے یہ مقدمہ ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے، فاضل مرتب نے جس محنت و کاوش سے ان مکاتیب کو مرتب کیا ہے اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مکاتیب میں جن اشخاص اور مقامات کا

ذکر آیا ہے حاشیہ میں اس کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اور مکاتیب کے مسائل و مباحث کی فہرست دیدی گئی ہے، جو اردو مجموعہ مکاتیب کے لیے نئی چیز ہے، اس سے مکاتیب سے استفادہ میں سہولت ہوگی لیکن فاضل مرتب نے جماعت اسلامی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں شدت زیادہ ہے، ممکن ہے جماعت اسلامی میں کچھ خامیاں ہوں لیکن وہ اتنی سخت رائے کی مستحق نہیں۔

مختصر حیات حمید :۔ مرتبہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب ناصر اصلاحی، متوسط تقطیع ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۵۰؍ پیسے، پتہ :۔ دائرہ حمیدیہ، مدرستہ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ۔ یو۔پی۔

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سوانحعمری کا شائقین اور قدر دانوں کو عرصہ سے انتظار تھا، ان کے طلب و تقاضے سے زیر نظر کتابچہ شائع کیا گیا ہے، یہ دو مضامین پر مشتمل ہے، پہلا مولانا کے خاص واقف کار اور متعدد علمی و تعلیمی کاموں میں شریک و مشیر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ہے، جو مولانا کی وفات کے بعد ہی معارف کے دو نمبروں میں چھپا تھا، اور دوسرا ان کے لائق شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی کا لکھا ہوا ہے، یہ دونوں مضامین اپنے معلومات کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں، ان سے مولانا کے حالات و واقعات زندگی کے علاوہ ان کے بعض اہم خصوصیات و کمالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے مگر ان کا اصل کارنامہ اور عمر بھر کا سرمایہ ان کے علوم و افکار اور قرآنی تحقیقات و نظریات ہیں، ان کے مفصل تعارف کے بغیر ان کی کوئی سوانحعمری مکمل نہیں کہی جا سکتی، لیکن مفصل کے لیے مختصر کی تعویق و تاخیر مناسب نہ تھی، اس لیے دائرہ حمیدیہ کے انچارج مولوی عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی نے ان مضامین کو یکجا کر کے شائع کر دیا ہے، تاہم مولانا کی مفصل سوانحعمری کا دین اب بھی ان کے تلامذہ و متوسلین کے ذمہ باقی ہے۔

"م"

جلوۂ حقیقت :۔ مرتبہ مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۵۲ قیمت ئے روپیہ پتہ :۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔

یہ فاضل مصنف کے دس علمی و مذہبی مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں عقیدۂ توحید پر بعض پہلوؤں سے مفید بحث کی گئی ہے، اس کے بعد تین مضامین میں عقیدۂ رسالت کی اہمیت و ضرورت، انبیاء کی عصمت احادیث کی عظمت اور محدثین کے اہتمام اور روایت و درایت کے اصولوں کا ذکر ہے، آخری چھ مضامین بعض کتابوں اور مضامین کے جواب میں تحریر کئے گئے، اور مناظرانہ رنگ کے ہیں ان میں حضرت علیؓ، حسنینؓ کے مناقب اور سانحۂ کربلا اور اس سلسلہ کے دوسرے مباحث ہیں، گذشتہ کئی سال سے یہ موضوع زیر بحث ہے، اور اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں عموماً افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، زیر نظر مضامین گو سنجیدہ اور محققانہ ہیں لیکن وہ بھی اس سے خالی نہیں ہیں، حضرت امیر معاویہؓ و عمرو بن عاصؓ کے لیے ترضیہ و ترحیم کے وہ قائل نہیں ہیں، حالانکہ صحابہ تو درکنار عام علماء و اخیار کے لیے بھی یہ مستحب ہیں، جابجا حضرت عثمانؓ پر کنبہ پروری کا الزام عائد کیا گیا ہے مگر کیا اسکی وہی توجیہ نہیں ہو سکتی تھی جو خود مصنف نے صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴ پر جناب امیرؓ کے طرز عمل کے بارے میں کی ہے، بعض صحابہ کے متعلق بھی انداز بیان نامناسب ہے، بعض اقوال بلاحوالہ نقل کئے گئے ہیں، اور بعض میں قدیم مستند کتابوں کے بجائے مصر کی جدید کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، اس لیے ان سے اخذ کردہ نتائج خود قابل بحث ہیں، ان خامیوں سے قطع نظر کتاب لائق مطالعہ ہے، خصوصاً ابتدا کے چاروں مضامین جامع اور مفید ہیں۔

اردو غزل ولی تک :۔ مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اعلیٰ صفحات ۱۵۶، مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ پیسے پتہ :۔ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۲

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، پہلے ایڈیشنوں کا ان صفحات میں ذکر ہو چکا ہے، اس میں اردو زبان کے ابتدائی دور کے ریختہ اور غزل کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، یہ تین ادوار میں منقسم ہے، پہلے میں ریختہ کی لفظی و اصطلاحی تحقیق، دوسرے میں تاجداران دکن کی اردو نوازی اور غزل کی سرپرستی اور

تیسرے میں دکنی اردو زبان خصوصاً غزل میں اصلاح واضافہ وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں ہر ہر دور کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے، اس ایڈیشن میں بعض ترمیم واضافہ بھی کیا گیا ہے اسلئے یہ پہلے ایڈیشنوں کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور بہتر ہے۔

ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے، اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب، لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق، خواص، — از۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات ۴۸ - ۴۰، ۳۲، ۳۲، ۲۴ قیمت ۷۵، ۵۰، ۵۰، ۵۰ پیسے پتہ :- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چار اصلاحی ودعوتی تقریریں ہیں جنکو اصلاح واضافہ کے بعد انھوں نے افادۂ عام کے لیے کتابچوں کی صورت میں شائع کیا ہے، پہلی تقریر میں ہندوستان کے زبوں وابتر حالات اور اس کو درپیش متعدد خطرات کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ اسلام انکا سدباب کرکے ملک کو صالح اور صحتمند بنا سکتا ہے، دوسری میں ملت ابراہیمی وامت محمدی کے امتیازات وخصوصیات، اسلام کے ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے اور اس امر کا ذکر ہے کہ مسلمان ان اوصاف وخصوصیات اور اپنے قومی امتیازات اور ملی تشخص کو برقرار رکھکر بھی ملک ووطن کی مفید خدمت کر سکتے ہیں، تیسری تقریر میں موجودہ زمانہ کے سنگین فتنہ لسانی عصبیت کی تباہ کاریاں بیان کرکے اسکو اسلام کی تعلیم کے منافی بتایا ہے اور دور حاضر کے مسلمانوں کو اس سے بچنے اور اس طرح کے بعض تازہ عبرتناک واقعات سے سبق حاصل کرنیکی دعوت دی ہے، چوتھی تقریر میں مسلمانوں کے طبقہ خواص کو خطاب کیا گیا ہے، اور خواص کے جاہلی تصور اور اسلامی مفہوم کے فرق کو واضح کرکے تاریخ اسلام کی روشنی میں خواص کی خصوصیات، ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، اس ضمن میں رائج الوقت خواص کی تصویر بھی آگئی ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کے خط وخال پوری طرح نظر آجاتے ہیں، اور بہتوں کو اپنی تصویر نظر آجائے گی۔

ض

جلد ۱۲ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۳ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

تیسرے میں دکنی کی اردو زبان خصوصاً غزل میں اصلاح و اضافہ وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں ہر ہر دور کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے، اس ایڈیشن میں بعض ترمیم و اضافہ بھی کیا گیا ہے اسلئے یہ پہلے ایڈیشنوں کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور بہتر ہے۔

ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے، اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب، لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق، خواص، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحات ۴۸، ۴۰، ۳۲، ۳۲، ۲۲، قیمت ۷۵، ۵۰، ۵۰، ۵۰، ۴۰ پیسے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ۔

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چار اصلاحی و دعوتی تقریریں ہیں جنکو اصلاح و اضافہ کے بعد انھوں نے افادۂ عام کے لیے کتابچوں کی صورت میں شایع کیا ہے، پہلی تقریر میں ہندوستان کے زبوں و ابتر حالات اور اس کو درپیش متعدد خطرات کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ اسلام انکا سدباب کرکے ملک کو صالح اور صحتمند بنا سکتا ہے، دوسری میں ملت ابراہیمی و امت محمدی کے امتیازات و خصوصیات، اسلام کے ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے اور اس امر کا ذکر ہے کہ مسلمان ان اوصاف و خصوصیات اور اپنے قومی امتیازات اور ملی تشخص کو برقرار رکھکر بھی ملک و وطن کی مفید خدمت کرسکتے ہیں، تیسری تقریر میں موجودہ زمانہ کے سنگین فتنہ لسانی عصبیت کی تباہ کاریاں بیان کرکے اسکو اسلام کی تعلیم کے منافی بتایا ہے اور دور حاضر کے مسلمانوں کو اس سے بچنے اور اس طرح کے بعض تازہ عبرتناک واقعات سے سبق حاصل کرنیکی دعوت دی ہے، چوتھی تقریر میں مسلمانوں کے طبقہ خواص سے خطاب کیا گیا ہے، اور خواص کے جاہلی تصور اور اسلامی مفہوم کے فرق کو واضح کرکے تاریخ اسلام کی روشنی میں خواص کی خصوصیات ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، اس ضمن میں رائج الوقت خواص کی تصویر بھی آگئی ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کے خط و خال پوری طرح نظر آجاتے ہیں، اور بہتوں کو اپنی تصویر نظر آجائے گی۔

ض

جلد ۱۱۲　ماہ رجب المرجب ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۳ء　عدد ۲

مضامین